اجنبی

افضل اقبال

اچھی کتاب
کا
نکھار ہمیشہ
قائم
رہتا ہے

اجنبی

اجنبی

(ناول)

تصنیف: آلبیر کامیو

ترجمہ: ڈاکٹر افضل اقبال

تعارف: ڈاکٹر حسن عسکری

ناشر

آئینۂ ادب ـ چوک مینار ـ انارکلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار: ۱۹۷۹ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت: پندرہ روپے

اہتمام

م، ع، اسلام، آئینۂ ادب ـ چوک مینار

انارکلی —— لاہور

فون نمبر —— ۶۷۵۰۲

—— طفیل آرٹ پرنٹرز ـ لاہور ——

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
(حالیؔ)

خالدہ
کی — یاد — میں

پیش لفظ

"اجنبی" پہلی بار ۱۹۴۲ء میں چھپا تھا۔ مگر جب آلبیر کامیو کو ۱۹۵۷ء میں ادب کا نوبل پرائز ملا تو اس مختصر ناول کا دنیا میں بہت چرچا ہوا۔ میں اس وقت ہسپانیہ میں پاکستانی سفارت کا وبیراؤل تھا۔ ان دنوں فرانس کے مشہور فلسفی ژاں پال سارتر کا بہت شہرہ تھا۔ قہوہ خانوں میں اُس کے نئے فلسفۂ ہستی کی تحریک پر گرما گرم بحثیں ہوا کرتیں۔ ہم بھی اس دماغی عیاشی سے لطف اندوز ہوتے۔ مگر سچ بات تو یہ ہے کہ اُس کا فلسفہ صحیح طور پر کسی کے پلّے نہ پڑتا۔ آلبیر کامیو کا ژاں پال سارتر کی تحریک سے گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ جب یہ ناول چھپا، تو یاروں نے اُس کی تعریف میں زمین آسمان کے "قلابے ملا دیئے۔

کامیو بہت عرصہ الجزائر میں عربوں کے ساتھ رہا۔ مگر ایک اجنبی کی طرح وہ اُن کے تمدن کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ اور اُن کی تہذیب سے نہ اُسے دلچسپی تھی نہ ہمدردی۔

اس ناول میں ایک عرب عورت کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔ اسے رسوا اور ذلیل کیا جاتا ہے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرب عورت کو محبت کرنے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا۔ وہ اپنے ہی ملک میں ایک غیر ملکی کی صرف ایک داشتہ بن کر رہ سکتی ہے۔ فرانسیسی بیوی تو شادی کے بعد بھی دوسرے مردوں سے راہ و رسم پیدا کر سکتی

ہے۔ مگر عرب عورت کو صرف یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ نان و نفقہ کے عوض عمر بھر کے لئے اپنا سب کچھ ناموس، عزّت، عصمت، وفا ایک مرد کی نذر کر دے۔

اس ناول میں ایک مریل کتّے کا کردار اس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اس سے نہ صرف گہری ہمدردی ہو جاتی ہے۔ بلکہ جب اُسے ذرا بھی سی سزا ملتی ہے تو اس کے مالک پر بہت غصّہ آتا ہے۔ برعکس اس کے جب عرب عورت کی خاصی مرمّت ہوتی ہے تو اُس پر کسی کو ترس نہیں آتا۔ ایک عرب کڑیل جوان موت کی گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور قاری کی ہمدردی کا طوفان تمام تر قاتل کی طرف امڈتا چلا جاتا ہے۔

ناول کے ہیرو موسیو مرسو کا کردار بہت ہی سادہ اور پیچیدہ ہے۔ وہ ایک نہایت دلچسپ شخصیت ہے۔ مگر اس کا سمجھنا کچھ اس قدر آسان نہیں ہے۔ وہ اکثر گم سُم رہتا ہے۔ کبھی کبھار بات کرتا ہے تو یہی ایک آدھ جملہ، ہلکی سی طنز، مبہم سا کنایہ اشارہ۔ مگر موسیو مرسو یاروں کا یار ہے۔ نہ کسی سے بغض نہ عناد۔ چھوٹی سی بات پر خوش ہو جاتا ہے اور بڑی سے بڑی بات پر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایک سادہ لوح انسان ہے، مرنجاں مرنج، زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر وہ پھولا نہیں سماتا اور بڑے بڑے رنج و غم ہنسی خوشی برداشت کر لیتا ہے۔ ع

نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

غرض ایک مجموعہ اضداد ہے۔ دیوانہ مگر کارِ خویش سے بیگانہ۔ کچھ پلّے نہیں پڑتا اور سمجھ بھی کیونکر آئے۔ وہ بہت کچھ کہتا بھی تو نہیں۔

چنانچہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ لفظوں کے معنی تو لُغت میں مل جاتے ہیں، مگر معنوں کی تہ تک پہنچنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہم نے برسوں کوشش کی مگر آخر کار تنگ

اگر کام ادھورا چھوڑ دیا۔ جب اپنی تسلی ہی نہ ہو تو کسی اور کی سمع خراشی سے کیا حاصل۔ سوچا کہ فرانسیسی ایک خوبصورت کلاسیکی زبان ہے اور گیسوئے اردو ابھی منّت پذیر شانہ ہے، ایسے میں اس قدر حساس ناول کا کامیاب ترجمہ کیونکر ہو سکے گا۔ اور اپنے عجز کا یہ عالم کہ نہ ایک زبان پر قدرت ہے نہ دوسری پر۔ جوانی کے جوش میں خواہ مخواہ وہ کام شروع کر ڈالا جس سے اچھے بھلے استاد گھبرائیں۔ مدتوں ترجمہ کا مسودہ میرے کاغذات میں پڑا رہا۔

میں ۱۹۷۲ء میں برازیل میں پاکستان کا سفیر تھا۔ بیگم اچانک بیمار پڑیں۔ برازیلیہ میں علاج کا خاطر خواہ بندوبست میسر نہ تھا۔ چنانچہ انہیں ساں پاؤلو سے جانا پڑا، جہاں اُن کا ایک بڑا اپریشن ہوا۔ اُن کی تیمارداری کے دوران میں نے دیکھا کہ میری بیٹی روبینہ جو فرانسیسی سے خوب واقف ہے الکامیو کا ناول پڑھ رہی ہے۔ جی چاہا کہ بیٹی کے ساتھ مل کر پھر سے "اجنبی" کا ترجمہ کیا جائے۔ ہم نے ہسپتال میں کام کا آغاز تو کر دیا مگر ع

عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

خدا خدا کرکے بیگم کی رہائی ہسپتال سے ہوئی۔ اللہ نے اُس کی جان بخشی اور ہم ترجمہ کا کام بُھول گئے۔ پچھلے برس ڈاکٹر محمد اجمل پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ وہ میرے ہم جماعت ہیں اور جگری دوست۔ میں نے اُن سے اپنی حماقت کا ذکر کیا تو اُنہوں نے مسودہ اٹھا کر ڈاکٹر لطیف بابری کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر بابری اُن دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں فرانسیسی زبان کے استاد تھے۔ اُنہوں نے میری کوشش کو نہ صرف سراہا بلکہ دوست کے حق میں مبالغہ آمیز تعریف کی۔ میں ذرا چونکا۔ ہمت کرکے نظرِ ثانی کے لئے وقت تلاش کیا۔ ترجمہ میں اس قدر غلطیاں نظر آئیں کہ میں نے از سرِ نو کام کا آغاز کیا۔ سال بھر کی محنت کے بعد جب مجھے ذرا اطمینان سا ہوا تو میں نے ڈاکٹر حسن عسکری کو تکلیف دی کہ وہ ازراہِ کرم مسودہ کو ایک نظر

دیکھ لیں۔ ڈاکٹر عسکری فرانسیسی زبان کے مزاج سے خوب واقف ہیں اور اردو کے تو ایک صاحب طرز مصنّف ہیں۔ اُنہوں نے "اجنبی" کے ایک ایک جملہ کو غور سے پرکھا۔ محاورہ اور تذکیر و تانیث کی جو غلطیاں اُنہوں نے درست کیں، وہ صرف ایک صاحبِ زبان کا ہی حصّہ تھا۔

اب ایک طویل مدّت کی پس و پیش کے بعد میں جسارت کر رہا ہوں کہ یہ ترجمہ قارئین کے سامنے پیش کروں۔ اگر آپ میں سے ایک آدھ پڑھنے والے نے بھی یہ کتاب پسند کی تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری برسوں کی محنت ٹھکانے لگی۔

آخر میں مجھے دو دوستوں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے مجھے یہ مژدہ بھیجا کہ پاکستان میں کاغذ کی بہت کمی ہے، اس لئے کتاب چھپوانے کا خیال فی الحال ترک کر دینا چاہیئے۔ پروفیسر محمد سرور نے لکھا کہ آخر کیوں؟ ہمارے یہاں کتابوں پر نہ مصنّف نہ ناشر گزر اوقات کر سکتا ہے۔ اگر تسکین ذوق ہی مقصود ہے، تو پھر ایسے ناشر کی طرف رجوع کیا جائے جو روٹی کمانے کے لئے انڈے اور مُرغیاں بیچتا ہے اور ادب کی خدمت کی خاطر معیاری کتابیں چھاپتا ہے۔

پاکستان ہاؤس سٹاک ہام (سویڈن)
۲۶ - دسمبر ۱۹۷۴ء

افضال اقبال

تعارف

"اجنبی" شائع تو ہوا تھا ناول کی حیثیت سے، مگر ۱۹۴۲ء سے اب ۱۹۷۵ء تک کے عرصے تک یہ ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ اسے نہ تو دوسری جنگِ عظیم سے الگ کیا جا سکتا ہے، نہ ۱۹۶۸ء کی طالب علموں کی شورش سے، نہ مغرب کے نوجوانوں کی وارفتگی اور ذہنی و اخلاقی پراگندگی سے، نہ مغربی شہروں کی لاحاصل اور بے مقصد تشدد پسندی سے۔ مراد یہ نہیں کہ یہ ساری شورشیں اسی کتاب سے پیدا ہوئی ہیں، مگر یہ کتاب اس پوری صورتِ حال کا ایک جز ضرور ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ نہ صرف مغرب میں بلکہ مشرق میں بھی بعض نوجوانوں کی ذہنی ساخت و پرداخت میں اس کتاب کا خاصا دخل ہے۔ چنانچہ فی الحال اس کتاب پر محض ناول کی حیثیت سے غور کرنا کافی نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں اس کتاب کو مصنف آلبیر کامیو کی ذاتی زندگی سے بھی الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ فرانس سے باہر کامیو کی شہرت دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہوئی اور وہ حریت پسند، انسان دوست، ڈراما نویس، ناول نگار اور فلسفی کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے آئے۔ سارتر کی دوستی نے اُن کی شہرت کو اور ہوا دی اور انہیں بھی "فلسفۂ زلیست" والے گروہ سے متعلق سمجھا گیا۔ مگر چند دن گزرے تھے کہ اُن کی سارتر سے تُو تُو میں میں ہو گئی اور سارتر

نے اعلان کر دیا کہ کامیو کا "فلسفۂ زلیست" والی جماعت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ فلسفی بھی نہیں "معلمِ اخلاق" ہیں۔ یہ فرانسیسی ادب کی ایک خاص اصطلاح ہے جو سترھویں صدی کے اُن ادیبوں پر دلالت کرتی ہے جنہیں ذہنِ انسانی کی تفتیش کا شوق تھا اور اپنی اس تفتیش سے چند اخلاقی نتائج بھی برآمد کرتے تھے ——— گو ان میں سے بعض نتائج ہم مشرقی لوگوں کو بداخلاقی سے قریب تر معلوم ہوں گے۔ خیر جن دنوں یہ لڑائی ہوئی اُس زمانے میں سارتر استعمار کی مخالفت اور حریت پسندانہ تحریکوں کی حمایت کر رہے تھے ——— گو فی الحال وہ گھٹنے کدھر جھکیں گے، پیٹ کی طرف کے بمصداق اسرائیل کے حامی ہیں۔ سارتر کی چوٹ پر استعمار کے حامیوں نے کامیو کو بانس پر چڑھایا اور انہیں "عظیم انسان دوست" کا لبادہ اڑھایا۔ کامیو نے بھی اس لبادے کا خوب حق ادا کیا اور انسانی جذبات سے ہمدردی اور رقتِ قلب کے بہانے الجزائر کی تحریکِ آزادی کی مخالفت کر ڈالی اور نوبل پرائز بھی مفتانے میں لے لیا۔ اگر موٹر کے ایک "بے مقصد" حادثے میں وہ ہلاک نہ ہو جاتے تو کئی اور انعام لے چکے ہوتے۔

یہ باتیں سنانے سے میرا مطلب قارئین کو اس کتاب اور اس مصنف سے بدظن کرنا نہیں، بلکہ ان دونوں کی شدید اہمیت واضح کرنا ہے۔ یہ کتاب پڑھے بغیر آپ نہ تو مغرب کے موجودہ معاشرے سے پوری طرح واقف ہو سکتے ہیں نہ مغرب کی سیاست سے۔ جس حد تک مشرق کے لوگ اندھا دھند مغرب کے ذہنی رجحانات کا اثر قبول کر رہے ہیں، وہاں تک مشرق کے بعض طبقوں کو سمجھنے کے لئے بھی یہ کتاب پڑھنا ضروری ہے کیونکہ عربی زبان کے ادبی رسالوں میں بھی "العبث" کا نعرہ جلی حروف میں چھپا ہوا نظر آتا رہتا ہے۔ غرض اس کتاب کی کئی حیثیتیں ہیں۔ یہ ناول بھی ہے، اخلاقیات کی کتاب بھی ہے،

فلسفہ طرازی بھی ہے اور مغربی معاشرے میں رونما ہونے والے اثرات اور نتائج کے اعتبار سے نوجوانوں کے لیے ہدایت نامہ بھی۔

پہلے ناول کے اعتبار سے دیکھئے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان مغربی ناول میں ایک رجحان یہ بھی چل پڑا تھا کہ جس چیز کو عام لوگ "کہانی" کا نام دیتے ہیں، وہ عنصر کم سے کم ہو۔ اس کے برخلاف فرانس میں مارلو کے ناول اور امریکہ میں ہیمنگ وے وغیرہ کے ناول بھی تھے جن میں واقعات اور جسمانی افعال کی خاص اہمیت تھی۔ مگر فی الجملہ جدید طرز کے ناولوں میں دروں بینی کا رنگ بڑھا ہوا تھا۔ کامیو نے دروں بینی اور خودنگری کے بجائے اپنے ناول کی بنیاد کہانی پر رکھی۔ اُن کی جدت یہ تھی کہ جو افعال اور واقعات بیان کئے جائیں وہ اتنے عمومی ہوں کہ بے کیف بن جائیں۔ یوں تو اس ناول میں قتل بھی ہوتا ہے، لیکن اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہیجان انگیزی کی شق میں نہیں آتا۔ قتل کرنے والا ایک خودکار مشین کی طرح عمل کرتا ہے۔ اس لئے یہ واقعہ جذبات سے خالی ہے۔ جہاں تک پیش پا افتادہ تفصیلات بیان کرنے کا تعلق ہے یہ کام زولا کے پیرو سو سال پہلے سے کر رہے تھے۔ کامیو نے خارجی ماحول کی صرف وہ تفصیلات بیان کی ہیں جو ایک مُردہ دل اور بے کیف آدمی کے شعور میں تھوڑا بہت ردّعمل پیدا کر سکتی ہیں۔ اسی بات کو اُن کے قصیدہ خواں یوں کہتے ہیں کہ کامیو کا طرزِ تحریر "جوہری" ہے اور وہ ہر ایسی تفصیل سے بچتے ہیں، جو غیر ضروری ہو۔ مصنّف کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر مظہر سے اکتاہٹ اور بے نیازی کی فضا پیدا کی جائے۔ مرکزی کردار کا شعور اُس وقت جاگتا ہے جب اس سے ارادے کے بغیر ایک قتل سرزد ہو جاتا ہے اور اُسے جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ یہاں سے کہانی عام قاری کے لئے بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً مقدمے کی کارروائی۔ لیکن انہی واقعات سے

سے کامیو نے اپنے اخلاقیاتی اور فلسفیانہ نکتے پیدا کئے ہیں۔

کردار نگاری میں کامیو کی جدت یہ ہے کہ ان کے ناول کا ہیرو کوئی واضح شخصیت ہی نہیں رکھتا، بس عادات کا غلام ہے، خارجی زندگی میں بھی اور داخلی زندگی میں بھی اور عادات بھی وہ جو آج کل کے شہروں میں نچلے متوسط طبقے کے ہر آدمی کی ہوتی ہیں۔ نہ تو اس کے جذبات میں کوئی شدت ہے نہ احساسات میں تازگی۔ سوچنے کی صلاحیت تو اُس میں ہے ہی نہیں، بلکہ اپنی ہستی کا شعور بھی نہایت مبہم ہے۔ جیل کی کوٹھڑی میں بند ہونے کے بعد اُسے اپنی ذات کا احساس ہوتا ہے اور عدالتی کارروائی کے دوران بڑھتا جاتا ہے۔ بلکہ حالات اُسے معاشرے اور انسانی زندگی کے بارے میں بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل اس عمل کو "سوچنا" نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہیرو مغربی شہروں کے عام آدمیوں کی طرح غبی ہے، اُس کا ذہن ازخود حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن عدالت میں اُسے نئے تجربات پیش آتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ اُس کے معمولی سے معمولی اور بے ضرر فعل کو اُلٹے معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ مثلاً اس کی سنگ دلی کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس کی ماں کا جنازہ تدفین کا انتظار کر رہا تھا تو اُس نے قہوے کی ایک پیالی قبول کر لی تھی۔ اس طرح کے خارجی واقعات اسے سوچنے پر نہیں بلکہ یہ دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اُس کے معاشرے میں، اور پھر انسانی زندگی میں کوئی بات عقل کے مطابق نہیں ہوتی اور اُس کا چھوٹے سے چھوٹا فعل یا احساس معاشرے کی نظر میں ملعون بن سکتا ہے۔ اُوپر سے وہ معاشرے کو خوش کرنے کا فن نہیں جانتا اور صرف وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے۔ اب اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس معاشرے کا رُکن نہیں بلکہ محض اجنبی اور بیگانہ ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ تو الگ رہا، وہ تو پورے نظامِ زندگی اور کائنات میں بھی اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس

کا کسی چیز سے کوئی رشتہ نہیں۔ چونکہ اپنے معاشرے یا کائنات یا زندگی سے یگانگت کا رشتہ حاصل کرنے کا کوئی طریقہ بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے اُس کی حیثیت باغی کی بھی ہو جاتی ہے۔ بہرحال یہ حقیقت اُس کی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ زندگی اور کائنات کا نظام بے عقل (عرب ادیبوں کی اصطلاح میں "لامعقول") مہمل، بے معنی، بے مقصد اور عبث ہے۔ یہ "عرفان" حاصل کرنے کے بعد وہ خوشی خوشی پھانسی کے تختے پر چڑھ جاتا ہے۔

اس کہانی اور اس کردار کے ذریعے کامیو نے پہلے تو مروجہ اخلاقی اقدار کی خامی دکھائی ہے کہ وہ فرد کی داخلی کیفیات اور عوامل کو نظر میں رکھے بغیر نیک اور بد کے فیصلے صادر کر دیتی ہیں۔ اور اس طرح فرد کے ساتھ ہمیشہ بے انصافی ہوتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر نیا نہیں۔ اُنیسویں صدی کے روسی ناول نگار یہ بات بار بار کہہ چکے ہیں۔ اخلاقیات کا یہ تصور سوز و گداز سے مملو ہے۔ لیکن اگر اس پر عمل ہونے لگے تو دنیا میں عدالتیں اور قانون سب معطل ہو جائیں۔ مغرب کے بعض نوجوان پانچ سات "بے مقصد" قتل کرنے کے بعد اس اصول کے سہارے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرتے ہیں۔ خود کامیو نے اپنی ایک کہانی میں فرد کے لطیف احساسات سے ہمدردی کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا چاہا ہے کہ الجزائر کو آزاد نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس طرح کامیو کا مجوزہ اخلاقی نظام ایک طرف تو مغرب کی معاشرت کو درہم برہم کر رہا ہے اور دوسری طرف مغربی استعمار کا حمایتی بھی ہے۔

اس ناول سے جو فلسفہ برآمد ہوتا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی طبیعت کے مظاہر، معاشرے کے عوامل، زندگی اور کائنات کی نیرنگیاں ہر چیز لامعقول ہے، بے مقصد ہے، مہمل اور عبث ہے۔ کیونکہ ہم جس چیز کو عدل اور انصاف سمجھتے ہیں اُس کے خلاف جاتی

ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم جو ایک مسرت انگیز اور مربوط زندگی کی تمنا رکھتے ہیں وہ پوری نہیں ہونے پاتی۔ اگر آپ دو سال کے بچے سے اُس کا کھلونا چھین لیں تو اُس کی چیخوں سے بھی یہی فلسفہ برآمد ہوگا۔ لیکن کیا کیا جائے، مغرب کے دانش وروں کی ذہنی بساط بس اتنی ہی ہے۔ اس چیخ کو وہ مابعدالطبیعات کہتے ہیں۔ مغرب کا ذہنی زوال چودہویں صدی میں شروع ہوا تھا۔ آج ہم مغرب کو انحطاط کی اُس منزل کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ جہاں ذہن گھُل کر غائب ہو جاتا ہے۔ سترہویں صدی کے شروع میں دیکارت نے انسانی وجود کی یہ دلیل پیش کی تھی:۔

"میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں۔"

سوا سو سال بعد روسو اور اُس کے مقلدین کے یہاں اس کی شکل یہ ہو گئی:

"میرے اندر جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے میں ہوں۔"

اُنیسویں صدی کے وسط میں ایک حیثیت سے بودلیئر کا قول ہے:

"میرے حواس خمسہ کام کر رہے ہیں۔ اس لیے میں ہوں۔"

بیس سال بعد راں بو آیا:

"میرے حواس خمسہ اُلٹا کام کر رہے ہیں۔ اس لیے میں ہوں۔"

سنہ ۱۹۳۰ء کے قریب معاشی اور سیاسی بحران پھیلا تو مالرو، ہیمنگ وے اور اُن کے ہم نوا بولے:

"میں ارادی طور پر جسمانی فعل کا ارتکاب کرتا ہوں، اس لیے میں ہوں۔"

دوسری جنگ عظیم کے دوران کامیو نے انسانی ذہن کو بالکل ہی خارج کر دیا:

"مجھ سے غیر ارادی طور پر بے معنی و مقصد جسمانی فعل سرزد ہو سکتا ہے، اس لیے شاید میں ہو جاؤں۔"

اور جب "اجنبی" کا مرکزی کردار ہو جاتا ہے" تو اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کی پوری ہستی مہمل اور عبث (قرآن شریف کی اصطلاح میں "باطل") ہے۔ اپنی ہستی، اپنا معاشرہ اور اپنی کائنات اُسے بے معنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس قسم کا عدل اور مسرت، معقولیت اور مربوطیت حاصل کرنے کی اُسے تمنا تھی وہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کے عرفان کا نام مغرب میں "مابعدالطبیعاتی کرب و بیگانگی" رکھا گیا ہے۔

اس حقیقت کا اصلی نام ہوا پرستی ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق مسرت انگیز اور مربوط زندگی بسر کرنے کی، یعنی گُور کے پھول لینے کی ہوس ہمیشہ اور ہر زمانے میں رہی ہے۔ یہ غفلت انسان کے خمیر میں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ نجم میں اس بات پر غور کرنے کی تعلیم دی ہے کہ انسان جس چیز کی تمنا کرتا ہے کیا وہ اُسے ہمیشہ مل جاتی ہے؟ مگر انسان اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گھبراتا ہے۔ اُوپر سے شیطان اُسے لمبی چوڑی امیدیں دلاتا ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں یہ مضمون بار بار آیا ہے کہ کافر اصل میں تو اپنی ہویٰ کو پُوجتے ہیں۔ یہی اُن کا خدا ہے۔ (مثلاً بیکن سے لے کر مارکوزے تک سب کا خدا یہی ہے) یہ خدا مختلف شکلیں اور نام اختیار کرتا ہے۔ قرآن شریف نے کافروں سے خطاب کرتے ہوئے بار بار یہ بھی کہا ہے کہ جن خداؤں کو تم پُوجتے ہو یہ تم نے خود گھڑے ہیں اور تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے اُن کے نام بھی خود ہی رکھ لئے ہیں (مثلاً ایڈم اسمتھ، رُوسو، مارکس، نیٹشے، فرائڈ، برگسون، ڈی ایچ لارنس، سارتر اور کامیو نے) شروع سے آج تک سب کافروں کے رنگ برنگ فلسفوں کا بنیادی اصول یہی رہا ہے کہ نظامِ کائنات ہماری ہوا و ہوس کے مطابق نہیں چل رہا، اس لئے عبث اور لامعقول ہے۔ ہماری رائے کے مطابق چلنے لگے تو بامعنی، معقول اور مربوط بن جائے گا۔ اس کے برخلاف قرآن شریف

نے سورۂ مُلک میں انسان کو ایک خاص مراقبے کی تعلیم دی ہے فرمایا ہے کہ ہماری بنائی ہوئی کائنات پر بار بار نظر ڈال کے دیکھو، اس میں تمہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ جب بھی دیکھو گے، تمہاری نظر درماندہ ہو کر لوٹ آئے گی۔ اس مراقبے کے بعد بھی آدمی میں بصیرت پیدا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ کان سُن نہیں سکتے، دل سمجھ نہیں سکتا۔ چنانچہ کائنات کو عبث اور لامعقول بتانے والوں کے متعلق سورۂ صٓ آیت ۲۷ میں فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ط ذٰلِكَ ظَنُّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ج فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ۔

(ہم نے آسمان و زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں ان کو خالی از حکمت نہیں پیدا کیا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہیں۔ سو کافروں کے لئے بڑی خرابی ہے۔ یعنی دوزخ (ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانویؒ)

یہ تصوّر ہر دینی روایت کا لازمی جز ہے اور عیسائیت میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ کتابِ مقدس میں آیا ہے کہ خدا نے کائنات بنانے کے بعد اس پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ بہت اچھی ہے۔ اسی بات کو ازمنۂ وسطیٰ کے عیسائی متصوفین یوں کہا کرتے تھے کہ ہماری دنیا ساری ممکن دنیاؤں میں بہترین ہے اور جو کچھ موجود ہے یا جو کچھ واقع ہوتا ہے اُس کے مقاصد اور نتائج بہترین ہوتے ہیں۔ یہ مقولے آج کل اٹھارویں صدی کے رجائی فلسفیوں سے منسوب ہیں، خصوصاً لائب نٹز سے۔ لیکن لائب نٹز نے اس حقیقت کو یہ معنی دے دیئے ہیں کہ موجودات اور وقوعات کے بہترین مقاصد اور نتائج انسانی عقل کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ رجائی فلسفی اس اصول پر اس سختی سے عمل پیرا ہوئے کہ مضحکہ خیز بن گئے۔ مثلاً انھوں

نے کہا کہ زلزلے سے پرتگال کے لوگ تباہ ہوئے تو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اجنبیا کے لوگ بچ گئے۔ اس لئے والٹیئر جیسے عقل پرست نے اپنی کہانی "کاں دیدؔ" میں ان فلسفیوں کا مذاق اڑایا۔ روسو نے عقل کی مخالفت میں "فطرت" یعنی انسانی جذبہ اور جبلت کی پیروی کا اصول نکالا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات کے سارے تضاد جذبات کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ یہ دراصل مارٹن لوتھر اور پروٹسٹنٹ لوگوں کا مذہبی عقیدہ ہے۔ بودلیئر کے زمانے تک یہ بھی پتہ چل گیا کہ زندگی اور کائنات کے تضادات جذبے کی مدد سے بھی دُور نہیں ہوتے، بلکہ جذبات ایک خوفناک جہنم پیدا کرتے ہیں۔ راں بو نے دعویٰ کیا کہ میں تو اسی جہنم میں اتروں گا اور اسی کو جنت میں تبدیل کروں گا۔ مگر اسی زمانے میں صنعتی نظام بھی زور پکڑ رہا تھا اور انسان کو مشین میں تبدیل کرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ رنگ بودلیئر جیسے شاعروں کے علاوہ مارکس نے بھی دیکھ لیا تھا اور اس نے ماحول اور زندگی کے مظاہر سے مشینی دور کے انسان کی بیگانگی پر پوری تجزیاتی ہمت صرف کی ہے۔

کامیو کے ناول میں انسان مشین بن چکا ہے۔ اب نہ تو اس کی عقل کام کرتی ہے نہ جذبات، البتہ انسانیت کی آخری نشانی جبلت رہ گئی ہے اور وہ بھی میکانکی طور پر عمل کرتی ہے جس میں نہ تو انسانی ارادے کو دخل ہے نہ اختیار کو۔ ناول کے مرکزی کردار سے ایک قتل سرزد ہو جاتا ہے کیونکہ دھوپ تیز ہے اور اس کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ یہ شخص ہزار اجنبی اور بیگانہ سہی، لیکن دوسرے انسانوں کے درمیان رہنے پر مجبور ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی میکانکی عادتوں کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہیں جنہیں معاشرتی، اخلاقی یا انسانی اقدار کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ قاتل کو جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ قاتل مشین تو بن چکا ہے لیکن مرنے کو راضی نہیں۔ چھپکلی بھاگ گئی، کٹی ہوئی دُم ابھی پھڑک رہی ہے۔ صدیوں کے

انسانی ترکے میں سے چند تصورات ابھی باقی ہیں جو قتل کرتے وقت تو اسے یاد نہیں آئے تھے، لیکن اپنے اُوپر مصیبت پڑی تو اُس کی کھوپڑی میں کُلبلانے لگے ـــــ مثلاً عقل، جذبہ، عدل۔ جیل کی کوٹھڑی میں اُس پر یہ تجلّی ہوتی ہے کہ زندگی اور کائنات نہ تو عقل کو تسکین دیتی ہے نہ جذبے کو، خصوصاً انسانی تمنّاؤں کو تو ذرا بھی پورا نہیں کرتی۔ لہٰذا کائنات عبث اور باطل ہے۔

کامیو کے نزدیک یہی اصلی دانش مندی اور حکمت ہے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو ساری اقدار ہی ختم ہو جاتی ہیں اور زندہ رہنے کا جواز بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کے جواب میں کامیو نے کہا کہ کائنات کے عبث ہونے کا عرفان تو دانش مندی کی طرف پہلا قدم ہے۔ یہاں سے آگے چل کر ہر فرد اپنے لئے ایک مثبت نظامِ زندگی تلاش کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس ہدایت کے مطابق جن لوگوں نے سلوک کی راہ میں قدم بڑھایا، اُن میں سے بعض چرس پینے لگے، بعض مینار پہ چڑھ کے راہ گیروں پر گولیاں برسانے لگے اور بعض یہ خواب دیکھنے لگے کہ اگر ساری دُنیا کا تیل اور معدنی ذخائر ہمارے قبضے میں آ جائیں تو پھر وادی چین ہی چین نکلتا ہے۔

یہ تو ہوئی مغرب کی دانش وری ـــــ جس سے پوری طرح واقف ہونے کے لئے اس ناول کا نہ صرف پڑھنا، بلکہ اس کے رموز کو اچھی طرح سمجھنا لازمی ہے۔ دانش وری کی یہ صنف کوئی چار سو سال پہلے شروع ہوئی ہے۔ گو انگریزی شاعر چوسر نے تو چودھویں صدی کے آخر میں ہی اعلان کر دیا تھا کہ اب جہالت کا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس دانش وری کا نقطۂ آغاز یہ اصول ہے کہ اپنی زندگی کی تنظیم کے لئے انسان وحی کی رہنمائی سے آزاد ہو کر اپنے لئے اقدار خود ہی پیدا کر سکتا ہے۔ چار سو سال کے عرصے میں ہم نے دیکھا کہ مغرب نے

جو اقدار بھی پیدا کیں وہ ہوا و ہوس کا مظہر تھیں اور خود مغرب کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ نظامِ کائنات کو اٹھارہویں صدی والوں کی طرح معقول سمجھا جائے یا بیسویں صدی والوں کی طرح لامعقول، نتیجہ واحد ہوگا۔

اس کے برخلاف وحی کی رہنمائی یہ ہے کہ اقدار وہی کارآمد ہوں گی جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے ذریعے قائم ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے احکام بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو تکوینی اور دوسرے تشریعی۔ فی الاصل دونوں قسم کے احکام کی مصلحت پوری طرح انسانی عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ لیکن اسلام میں انسانی عقل کو دیس نکالا نہیں دیا گیا۔ امام غزالیؒ اور دوسرے مجتہدین کے نزدیک تشریع کے دائرے میں جو اصولی احکام ہیں اُن کی مصلحت عقلی دلائل کے ذریعے ثابت کی جا سکتی ہے۔ البتہ جزئیات میں ایمان بالغیب ضروری ہے۔ تکوینی احکام کی مصلحت معلوم کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ بات تو وہی جان سکتا ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے سے اور اُس کی ابتدا و انتہا دونوں سے واقف ہو اور یہ علمِ کلی صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے جس میں کوئی اُس کا شریک نہیں۔ انسان مکلف ہے صرف تشریعی احکام پر عمل کرنے کا۔ تکوینی احکام میں دین دار انسان قضا و قدر کی موافقت کرتا ہے، اُسے عبث نہیں بتاتا۔ کافر قضا و قدر سے لڑتا ہے۔ اور دین و دنیا ہر جگہ خوار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض دفعہ تکوینی احکام اور تشریعی احکام میں کھلا ہوا تضاد نظر آئے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے تشریعی حکم دیا کہ صرف میری عبادت کرو اور تکوینی طور پر مسلمان بھی پیدا کئے اور کافر بھی۔ پھر ہمیں یہ حکم بھی دیا کہ کفر اور کافر سے نفرت کرو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھو کہ اللہ نے کوئی چیز بے معنی اور عبث پیدا نہیں کی۔ ان احکام کا تضاد دُور ہوتا ہے ایمان کے ذریعے۔ مغرب والوں کے نزدیک ایمان کا مطلب ہے

ایک جذباتی کیفیت جس کا عقل سے کوئی واسطہ نہیں۔ مغرب جب انسانی عقل کو چھوڑتا ہے، تو نیچے حیوانی جبلت میں گرتا ہے۔ ہم جب انسانی عقل کو چھوڑتے ہیں تو اُوپر اٹھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عقل بھی دو قسم کی ہے ــــ عقلِ معاش اور عقلِ معاد۔ قرآن شریف نے بتایا ہے کہ عقلِ معاد کا مقام ہے قلب (مغرب والوں کے نزدیک عقل بھی جبلت کی آلۂ کار ہے اور قلب بھی جبلت کے مترادف ہے) اس عقلِ معاد کے ذریعہ اسلام، ایمان اور احسان کی حقیقت حاصل ہوتی ہے۔ عقلِ معاش یا نفس کی نظر سے دیکھا جائے تو کائنات عبث اور باطل معلوم ہوتی ہے۔ عقلِ معاد کی نظر سے دیکھا جائے تو کائنات کا حق ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کائنات کا بنانے والا موجودِ حق ہے۔

کائنات کو عبث سمجھنے سے کیسی زندگی پیدا ہوتی ہے وہ تو ہم اُوپر دیکھ ہی چکے ہیں۔ زندگی کو حقیقی معنوں میں مربوط بنانے کا نسخۂ کیمیا ہمیں قرآن شریف نے دیا۔ سورۂ آلِ عمران میں ایک طویل دُعا آئی ہے جس کے مختلف اجزا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے اپنے لئے خاص کر لیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص دُعا مرتبۂ شہود میں یہ تھی۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

(اے ہمارے رب! تو نے یہ عبث نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے۔ پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔)

یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر نقص سے پاک سمجھنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اُس کی بنائی ہوئی کائنات کو عبث نہ کہا جائے اور ایسے باطل عقائد کی پیدائش سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیئے چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقامِ خوف میں فرمایا کرتے تھے :۔

رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَہٗ ط وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔

(اے ہمارے رب! تُو جسے دوزخ میں ڈالے تو ضرور اُسے رسوا کر دیا اور سیاہ کاروں کا کوئی ساتھی نہیں۔)

یہاں اُن لوگوں کا عبرت ناک انجام بیان ہوا جو کائنات کو عبث کہہ کر اللہ تعالیٰ کی سبحانیت سے انکار کرتے ہیں۔ ایسے انجام سے بچنے کے لئے انبیاءؑ کی پیروی اور متابعت ضروری ہے۔ لہٰذا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقامِ تصدیق میں یہ دُعا مانگتے تھے:

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا

(اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو ایمان کے لئے پکارتے ہوئے سُنا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ، سو ہم ایمان لے آئے)

اس کے بعد ضرورت ہوتی ہے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور اپنی غلطیوں کی معافی چاہنے کی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقامِ انابت میں فرمایا کرتے تھے۔

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔

(اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے اُتار دے اور ہمارا نیکوں کے ساتھ خاتمہ کر۔)

اس کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ آدمی اپنے اعمال اور عبادات کی قبولیت کی اُمید رکھے، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقامِ رجا میں فرماتے تھے:

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ط اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔

(اے ہمارے رب! اور ہمیں دے جو اپنے رسولوں کی معرفت تو نے ہم سے وعدہ کیا۔ اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر۔ تو وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔)

اُمید میں بھی انبیاءؑ کا دامن نہیں چھوٹا۔ تمنا بھی اُس چیز کی نہیں کی جو نفس نے سُجھائی، بلکہ ان چیزوں کی جن کا وعدہ خود اللہ نے رسولوں کی معرفت کیا ہے۔ اور امید ہے بھی تو اپنی لیاقت کے بھروسے پر نہیں، بلکہ اللہ کی رحمت سے۔ غرض اپنے نفس کو پوری طرح اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور اُس کے رسولوں کے فرمودات کے تابع کر دیا۔ یہ ہوئی مربوط زندگی جس میں اجنبیت اور بیگانگی کا نام و نشان تک نہ رہا۔ جیسا حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہے، "اکیلا تو وہ ہوتا ہے جو اللہ سے غافل ہو۔ جب نفس کی ایک ایک خواہش اور حرکت وحی کی تابع ہو گئی تو نفس ہی فنا ہو گیا۔ اب کون یگانہ رہا اور کون بیگانہ، سب حق ہی حق ہو گیا۔"

تو مغرب کی دانشمندی ہمیں کیا سکھائے گی۔ بے چاری ننگی کیا نہائے گی، کیا نچوڑے گی۔ لیکن مغرب کے ہاتھوں میں ہائیڈروجن بم بھی ہے۔ ہمیں دیکھتے رہنا چاہئے کہ یہ ہاتھ کس وقت کس طرح عمل کرتے ہیں: اپنی محافظت کے لئے آپ کامیو کا یہ ناول ضرور پڑھئے۔ کامیو کی کتابوں کے ایرانی مترجم جلال آل احمد نے تو اپنے طویل مضمون "غرب زدگی" میں اس ناول کو "حقیرانہ بعنوانِ یک شرقی، بلکہ درست بعنوانِ یک مسلمان، صدرِ اسلام کہ بوحیِ آسمانی معتقد بودہ" پڑھا ہے۔ اور اسی کتاب میں قیامت کی علامتیں اور آثار

پائے میں۔ اور اپنے مضمون کو اس طرح ختم کیا ہے:

"بہمیں مناسبت قلم خود را باین آیہ تطہیر کنم کہ فرمود ــــــ اقترَبَتِ السّاعۃُ وانشقّ القمرُ"

۲ راگست ۱۹۷۵ء — محمد حسن عسکری

۱

امّی آج چل بسی یا شاید کل، مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔ بوڑھوں کی رہائش گاہ سے مجھے یہ تار وصول ہوا:

"امّی انتقال کر گئی۔ جنازہ کل۔ بہترین دُعائیں۔"

اس سے تو کچھ واضح نہ ہوا۔ شاید کل ہی کا واقعہ ہے۔

بوڑھوں کی رہائش گاہ مارینگو میں ہے۔ الجیر سے ۸۰ کلو میٹر۔ میں دو بجے کی بس پر شام ڈھلنے تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اس طرح میں جنازہ میں شامل ہو سکوں گا۔ اور کل شام آٹھ بجے لوٹ آؤں گا۔ میں نے اپنے افسر سے دو دن کی رُخصت مانگی۔ وجہ اتنی معقول تھی کہ وہ انکار تو نہیں کر سکتا تھا مگر وہ مطمئن بھی نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اُسے کہا بھی کہ

"یہ میرا قصور نہیں ہے۔"

اُس نے جواب نہ دیا۔

میں نے پھر سوچا کہ مجھے یوں نہ کہنا چاہیے تھا۔ عذر مجھے تو پیش نہیں کرنا تھا۔ بلکہ اس کا فرض تھا کہ وہ ماتم پُرسی کرے۔ مگر پرسوں جب وہ مجھے ماتمی لباس میں دیکھے گا وہ یقیناً اظہارِ ہمدردی کرے گا۔ فی الحال تو کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے امّی مری ہی

نہیں۔ دفن کے بعد یہ معاملہ مستند ہو جائے گا جب سرکاری کاغذات میں اس کا اندراج ہو جائے گا۔ میں نے دو بجے والی بس پکڑی۔ گرمی بہت تھی۔ میں نے حسبِ معمول سلیسط کے ریستوراں میں کھانا کھایا۔ سب نے میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا۔ سلیسط نے مجھ سے کہا:

"ہر ایک کی ماں ایک ہی ہوتی ہے۔"

جب میں چلا تو وہ مجھے دروازہ تک چھوڑنے آئے۔ میں ذرا گھبرایا ہوا تھا کیونکہ ضروری تھا کہ میں ایمینول کے یہاں جلدی جاؤں اور اُس سے ایک کالی ٹائی اور ایک کالا بازوبند ادھار مانگوں۔ کچھ مہینے ہوئے اُس کا چچا مر گیا تھا۔ میں فوراً وہاں سے رخصت ہوا۔

یہ بھاگم بھاگ، یہ جلدی، بس کے جھٹکے، پٹرول کی بُو، سڑک کی جھلملاہٹ اور دھوپ کی تیزی، ان سب نے میرا سر چکرا دیا۔ میں تقریباً سارا راستہ اونگھتا رہا۔ جب میں جاگا تو اپنا سر ایک سپاہی کے کندھے پر پایا۔ وہ مجھ پر مسکرا رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کہیں دُور سے آ رہا ہوں۔ میں نے بات ٹالنے کو کہہ دیا کہ ہاں۔

بوڑھوں کی رہائش گاہ گاؤں سے دو کوس کے فاصلے پر ہے۔ میں نے یہ راستہ پیدل طے کیا۔ میں اُس کو فوراً دیکھنا چاہتا تھا مگر چوکیدار نے مجھ سے کہا کہ پہلے ڈائریکٹر سے ملنا ضروری ہے۔ وہ چونکہ مصروف تھا۔ مجھے تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ اس اثنا میں چوکیدار سے باتیں کرتا رہا۔ آخرکار میری ملاقات ڈائریکٹر سے ہوئی۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں ملا۔ ایک پست قد بوڑھا آدمی جو فرانس کی لیجن (۱۸۷۰-۱۸۷۱) کا اعزازی تمغہ اپنے کار کے کاج میں لگائے ہوئے تھا۔ اُس نے مجھے اپنی چمکیلی نیلی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھایا اور اتنی دیر میرا ہاتھ پکڑے کھڑا رہا کہ مجھے سمجھ نہ آئی کہ کیونکر اپنا ہاتھ چھڑاؤں۔ پھر اُس نے

ایک رجسٹر دیکھ کر مجھ سے کہا:

"مادام مرسو یہاں تین برس ہوئے آئی تھیں۔ ایک آپ ہی اُن کا سہارا تھے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی بات پر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش شروع کی ہی تھی کہ اُس نے مجھے ٹوکا اور کہا:

"بیٹا! آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کی والدہ کا سارا فائل دیکھا ہے۔ آپ اُن کی تمام ضروریات پورا نہ کر سکتے تھے۔ انہیں ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ آپ کی آمدنی معمولی ہے اور بہرحال وہ یہاں بہت خوش تھیں۔"

میں نے کہا:

"جی ہاں ڈائریکٹر صاحب۔"

اُس نے مزید کہا:

"آپ کو معلوم ہے کہ یہاں اُن کے چند دوست تھے۔ وہ اگلے وقتوں کے لوگ تھے اور ان کے ساتھ مادام مرسو کی باہم مشترک دلچسپیاں تھیں۔ آپ نوجوان ہیں۔ آپ کے ساتھ وہ بور ہو جاتیں۔"

یہ سچ تھا۔ جب وہ میرے ساتھ گھر میں تھیں، تمام وقت اُن کی خاموش نگاہیں میرا پیچھا کیا کرتیں اور وہ یونہی اپنا وقت گزار دیتیں۔ جب وہ شروع شروع میں بوڑھوں کی رہائش گاہ میں گئیں تو اکثر رویا کرتی تھیں، مگر وہ عادت کی بات ہے۔ اگر انہیں چند مہینوں کے بعد وہاں سے نکال لیا جاتا تو وہ اسے بھی پسند نہ کرتیں اور پھر روتیں۔ یہ سب تو عادت ہی کی بات ہے۔ کچھ اسی وجہ سے پارسال میں وہاں تقریباً گیا ہی نہیں۔ کچھ وجہ یہ بھی تھی کہ میری اتوار ضائع ہوتی تھی اور ان سختیوں کا ذکر ہی کیا کہ بس پہ جاؤ، ٹکٹ خریدو اور

دو گھنٹے کا سفر طے کرو۔

ڈائریکٹر نے مجھ سے کوئی بات کی مگر میں نے کچھ توجہ نہ دی۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا:

"میرا خیال ہے کہ آپ اپنی والدہ کو دیکھنا چاہتے ہیں؟"

میں کچھ کہے بغیر کھڑا ہو گیا اور وہ دروازے کی طرف میرے آگے چل پڑا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اُس نے مجھے بتایا:

"ہم نے اُنہیں لاش گھر میں رکھوا دیا ہے تاکہ دوسروں پر بُرا اثر نہ پڑے۔ ہر مرتبہ جب کوئی پنشنر مرتا ہے تو دوسرے دو تین دن تک پریشان رہتے ہیں۔ اور ہمارے کام میں حرج ہوتا ہے۔"

ہم ایک صحن میں آئے جہاں بہت سے بوڑھے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گپ شپ کر رہے تھے۔ جب ہم وہاں سے گزرے تو وہ خاموش ہو گئے اور ہمارے بعد پھر بات چیت شروع ہو گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ طوطوں کا مجمع ہے۔ ایک چھوٹی سی عمارت کے دروازے پر ڈائریکٹر نے مجھ سے رُخصت چاہی۔

"میں یہاں آپ سے اجازت لیتا ہوں موسیو مرسو! میرے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو میں اپنے دفتر میں حاضر ہوں۔ اصولاً جنازے کا وقت صبح دس بجے طے ہو گیا ہے ہمارا خیال ہے کہ جب تک آپ میت کے پاس بیٹھنا پسند کریں گے۔ ایک آخری بات۔ —معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی والدہ نے اکثر اپنے ساتھیوں سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اُن کو مذہبی رسوم کے مطابق دفنایا جائے۔ میں نے تمام انتظامات کا ذمہ لے لیا ہے، مگر میں چاہتا تھا کہ آپ کو بتا دوں۔"

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ امی دہریہ تو نہیں تھیں مگر انہوں نے عمر بھر یہ بھی کبھی نہ سوچا تھا کہ اپنی زندگی مذہبی احکام کے مطابق گزار دیں۔

میں لاش گھر میں داخل ہوا۔ یہ ایک بہت روشن اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ دیواروں پر تازہ سفیدی ہوئی تھی اور چھت پر رنگین شیشوں کی ایک بڑی کھڑکی تھی۔ کمرہ سازو سامان سے آراستہ تھا۔ ایکس (X) کی شکل میں آرام کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں درمیان میں کھلی پڑی تھیں اور اُن پر میت کا صندوق رکھا تھا۔ ڈھکنا اپنی جگہ پر تھا۔ لکڑی پر صرف چمکتے ہوئے پیچ نظر آتے تھے جو ابھی پوری طرح کسے نہیں گئے تھے۔ وہ اخروٹ کی سیاہ چمکدار لکڑی کے تختے پر لگے ہوئے تھے۔ تابوت کے پاس ایک عرب نرس تھی، سفید لباس میں اور سر پر شوخ رنگ کا ٹپکا پہنے ہوئے۔ اس لمحہ چوکیدار میرے عقب سے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھاگا ہوا آیا تھا اور کچھ ہانپ رہا تھا۔

"میں نے صندوق پر ڈھکنا لگا دیا تھا۔ اب مجھے پیچ کھولنے پڑیں گے تاکہ آپ انہیں دیکھ سکیں۔" اُس نے کہا۔

وہ صندوق کی جانب بڑھا لیکن میں نے اُسے روک دیا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"تو آپ نہیں چاہتے؟"

میں نے جواب دیا: "نہیں —!"

وہ تھم گیا اور میں کچھ پشیمان ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ ضروری نہیں تھا کہ میں یوں کہتا۔ ایک لمحہ کے بعد اُس نے مجھ سے پوچھا:

"کیوں —؟"

مگر بغیر لعن طعن کے اور کچھ اس لہجہ میں جیسے کہ وہ محض اپنی اطلاع کے لئے سوال

کر رہا ہے۔ میں نے کہا:

"مجھے معلوم نہیں۔"

پھر اُس نے اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اور بغیر میری طرف دیکھے ہوئے آرام سے کہا:

"میں سمجھتا ہوں۔"

اُس کی آنکھیں خوبصورت تھیں، نیلی اور شفاف اور اُس کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ اُس نے مجھے ایک کرسی پیش کی اور خود بھی ایک کرسی لے کر میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ نرس اُٹھ کھڑی ہوئی اور باہر والے دروازے کی طرف چل دی۔ اس وقت چوکیدار نے میرے کان میں کہا:

"انہیں سرطان کی بیماری تھی۔"

چونکہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے نرس کی طرف آنکھ اٹھائی۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے آنکھوں کے نیچے ایک پٹی باندھ رکھی ہے جو اس کے سر کے گرد جا رہی ہے۔ ناک کی اُونچان پر پٹی ہموار تھی اور اُس کے چہرہ پر سوائے پٹی کی سفیدی کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ چلی گئی تو چوکیدار نے کہا:

"میں آپ کو تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں۔"

مجھے معلوم نہیں میں نے کیا اشارہ کیا مگر وہ میرے پیچھے کھڑا رہا۔ اپنے عقب میں اُس کی موجودگی کا احساس مجھے پریشان کر رہا تھا۔ سہ پہر کے وقت کمرہ خوبصورت روشنی سے بھرپور تھا۔ رنگین شیشوں کے سامنے دوز مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھ پر نیند غالب آ رہی ہے۔ میں نے بغیر مڑے ہوئے چوکیدار سے کہا:

"آپ یہاں بہت عرصہ سے ہیں؟"

اُس نے فوراً جواب دیا:

"پانچ برس سے۔"

جیسے وہ ازل سے میرے سوال کا انتظار کر رہا تھا۔

پھر اُس نے بہت باتیں کیں۔ مجھے یہ سُن کر بہت تعجب ہوا کہ وہ مارنگو کے ہسپتال کی نوکری چھوڑ دے گا۔ اس کی عمر ۶۴ برس کی تھی اور وہ پیرس کا رہنے والا تھا۔ میں نے اُسے ٹوکا:

"اچھا تو آپ یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں؟"

پھر مجھے یاد آیا کہ ڈائریکٹر کے پاس پہنچانے سے پہلے اُس نے مجھے امّی کے متعلق کچھ مشورہ دیا تھا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ ضروری ہے کہ انہیں جلد دفن کر دیا جائے کیونکہ یہاں گرمی بہت ہوتی ہے اور خاص طور پر میدانی علاقہ میں۔ پھر اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پیرس کا رہنے والا ہے اور اُس کو کسی طرح بھول نہیں سکتا۔ پیرس میں قاعدہ ہے کہ میت تین چار دن رکھتے ہیں مگر یہاں یہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ جھٹ موت پٹ دفن۔

اس پر اُس کی بیوی نے اُسے ٹوکا:

"چُپ بھی رہو۔ یہ باتیں بھلا موسیو کو کہنے کی ہیں۔"

بوڑھے کا چہرہ لال ہو گیا اور اُس نے مجھ سے معافی مانگنا شروع کی۔ میں نے ٹوکتے کہا:

"مگر کوئی بات نہیں — مگر کوئی بات نہیں!"

مجھے احساس ہوا کہ اُس کی بات صحیح اور دلچسپ تھی۔

پچھلے کمرے میں بیٹھے ہوئے اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مریض کی حیثیت سے

ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ جب وہ رخصت ہوا تو اُس نے چوکیدار کی آسامی کے لیے درخواست دے دی۔ میں نے کہا کہ خلاصہ یہ کہ وہ پنشنر ہے۔ اُس نے کہا کہ نہیں۔ میں ایک طرح سے پریشان تھا کہ وہ جب دوسرے پنشنروں کا تذکرہ کرتا تھا تو اُن کے لیے "وہ دوسروں" کی ترکیب استعمال کرتا تھا اور کبھی کبھار انہیں "بوڑھوں" کا خطاب دیتا تھا حالانکہ وہ عمر میں یقیناً اُن سے زیادہ بڑے نہیں تھے۔ مگر طبعی طور پر یہ ایک ہی بات تو نہیں ہے۔ وہ چوکیدار تھا اور اس رتبے کے اعتبار سے اسے دوسروں پر فضیلت حاصل تھی۔

اب نرس داخل ہوئی۔ آفتاب سُرعت سے غروب ہو رہا تھا۔ رات کا اندھیرا تیزی سے رنگین شیشوں پر چھا رہا تھا۔ چوکیدار نے بتیاں جلا دیں۔ کمرہ معاً روشن ہوا تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ اُس نے مجھے کھانے کی دعوت دی مگر مجھے بھوک نہ تھی۔ پھر اُس نے دُودھ والی کافی کی پیش کش کی جو میں نے قبول کر لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک طشت لیے ہوئے لوٹا۔ میں نے کافی پی لی۔ پھر مجھے سگریٹ پینے کی خواہش محسوس ہوئی مگر میں جھجکا کیونکہ میں طے نہ کر پایا تھا کہ امی کے سامنے سگریٹ پینا مناسب ہے یا نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ آخر انہیں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ میں نے چوکیدار کو ایک سگریٹ پیش کیا اور ہم دونوں پینے لگے۔

اس دوران اُس نے مجھ سے کہا:

"آپ جانتے ہیں کہ مادام یعنی آپ کی والدہ کے دوست بھی یہاں میت کی نگہبانی میں آپ کی شرکت کریں گے۔ یہ رسم ہے۔ مجھے کرسیاں اور کالی کافی تیار کرنا چاہیے۔"

میں نے اُس سے پوچھا:

"کیا ممکن ہے کہ وہ بتی بجھا دے؟"

سفید دیواروں سے ٹکرا کر روشنی میری آنکھوں پر سیدھی پڑ رہی تھی اور میں نڈھال ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا:

"یہ تو ممکن نہیں ہے کیونکہ بجلی کی تاریں کچھ اس طرح لگی ہوئی ہیں کہ یا تو ساری بتیاں جلتی ہیں یا کوئی بھی نہیں۔"

میں نے پھر اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ باہر گیا۔ لوٹا اور کرسیوں کو سنوارا۔ ایک تپائی پر کافی دان کے اردگرد اُس نے درجن بھر پیالیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ پھر وہ امی کی دوسری طرف میرے مقابل بیٹھ گیا۔ نرس بھی وہیں ایک فاصلہ پر بیٹھی موڑے کھڑی تھی۔ میں دیکھ تو نہیں سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ مگر اس کے بازوؤں کی حرکت سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی چیز بن رہی ہے۔ موسم خوشگوار تھا۔ کافی نے مجھے حرارت پہنچائی۔ کھلے دروازہ سے پھولوں کی مہک اندر آ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سمے میں اونگھ گیا تھا۔

کسی سرسراہٹ سے میں چونک اٹھا۔ میری جو آنکھ کھُلی تو پھر کمرہ مجھے بہت روشن نظر آیا۔ سامنے کسی چیز کا کوئی سایہ تک نہ تھا۔ ہر زاویہ اور نشیب صاف شفاف دکھائی دیتا تھا۔ اب امی کے دوست داخل ہوئے، تقریباً ایک درجن۔ بھرپور روشنی میں وہ خاموشی سے چل رہے تھے۔ وہ اس انداز سے بیٹھے کہ کسی کرسی کے سرکنے تک کی آواز نہ آئی۔ میں انہیں نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُن کے چہروں کے نقوش۔ اُن کی کوئی بھی حرکت میری نظروں سے نہ بچی۔ مگر پھر بھی مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ سچ مچ وہاں موجود

ہیں۔ میں نے اُن کی آواز تک نہ سُنی۔ تقریباً سبھی عورتیں ایپرن پہنے ہوئے تھیں، جو اُنہوں نے کچھ اس انداز سے کس کر باندھا ہوا تھا کہ اُن کی توندیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اب تک میں نے غور نہیں کیا تھا کہ بوڑھی عورتوں کے پیٹ کہاں سے اور کیوں کر اُبھر سکتے ہیں۔ مرد تقریباً سبھی دُبلے پتلے تھے اور سب ہاتھوں میں چھڑی تھامے بیٹھے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے چہروں پر آنکھیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جہاں آنکھ ہونی چاہیے وہاں صرف ایک ہلکا سا نشان نظر آتا تھا جھریوں کا ایک گھونسلا سا۔ جب وہ بیٹھ چکے تو اُن میں سے اکثر مجھے ایک گونہ غصہ سے دیکھ کر سر ہلاتے رہے۔ ان کے بے دانت منہ ہونٹوں کو چبا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ اعصاب کی بیماری میں مبتلا ہیں یا مجھے سلام کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنے مخصوص انداز میں مجھے آداب عرض کر رہے تھے۔ میرے خیال میں اپنے وہ مخصوص انداز میں مجھے آداب عرض کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ وہ چوکیدار کے ارد گرد میرے مقابل بیٹھے ہوئے محض سر ہلا رہے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے یہ بیہودہ خیال بھی سوجھا کہ وہ سب وہاں بیٹھے میرا محاسبہ کر رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک عورت نے رونا شروع کر دیا۔ وہ دوسری قطار میں تھی۔ میں اسے ٹھیک طرح دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے ایک ساتھی کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ وہ متواتر دھیمے دھیمے بین کرتی رہی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی نہ تھکے گی۔ دوسرے اس کی طرف کان بھی نہیں دھر رہے تھے۔ وہ خاموش، غمزدہ اور خستہ حال بیٹھے رہے۔ اُن کی نظر میت پر یا اپنی چھڑی پر جمی ہوئی تھی۔ وہ کسی اور چیز کو نگاہ میں نہیں لا رہے تھے۔ عورت مسلسل روتی رہی۔ میں بہت حیران ہوا کیونکہ میں اُسے نہیں پہچانتا تھا۔ میں

چاہتا تھا کہ اُس کی آواز مزید سنائی نہ دے۔ مگر اُسے یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ چوکیدار اس کی طرف جھکا اور اُسے کچھ کہا۔ اُس نے جواب میں سر ہلایا۔ کان میں کچھ ہلکے سے کہا اور پھر تسلسل سے رونا شروع کر دیا۔ اس کے بعد چوکیدار میری طرف آگیا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ کافی عرصہ کے بعد اُس نے میری طرف نگاہ اٹھائے بغیر مجھے یہ اطلاع دی:

"وہ آپ کی والدہ کی جگری دوست ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہاں وہ ان کی اکلوتی سہیلی تھی اور اب اس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا۔"

میں خاموش رہا۔ ہم اس طرح بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ اس عورت کی آہیں اور ہچکیاں ذرا کم ہوئیں۔ وہ ناک بہت پونچھتی رہی اور آخر کار وہ بھی چُپ ہو گئی۔ میں اونگھ رہا تھا ... سویا نہیں لیکن تھک بہت گیا۔ میری کمر میں درد ہونے لگا۔ اب سب حاضرین کی خموشی سے کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ سناٹے کے عالم میں گاہے گاہے صرف ایک آواز سنائی دیتی تھی مگر سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کیا ہے۔ آخر معلوم ہوا کہ چند بوڑھے اپنے گالوں کے اندرونی حصے کو چوس رہے ہیں اور اس عالم میں اُن کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکل رہی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہ تھا کیونکہ وہ سب کے سب اپنے خیالات میں گم تھے۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے سُوجھی کہ یہ میت جو ان کے درمیان پڑی ہے ان کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مگر اب مجھے یقین ہے کہ یہ ایک غلط خیال تھا۔

چوکیدار نے ہم سب کو کافی پیش کی۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے یاد نہیں۔ رات جوں توں گزر گئی۔ مجھے اتنا یاد پڑتا ہے کہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ سب بوڑھے ایک دوسرے کے کندھوں پر پڑے سو رہے ہیں ما سوا ایک کے جو اپنی کمر پر کوٹ ڈالے ہاتھ میں چھڑی تھامے میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا، کچھ اس انداز سے جیسے کہ

وہ صرف میرے بیدار ہونے کی انتظار میں تھا۔ میں پھر اُونگھ گیا۔ جب جاگا تو میری کمر میں درد بڑھ گیا تھا۔ رنگین شیشوں میں صبح اتر آئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا خواب سے بیدار ہوا اور زور سے کھانسنے لگا۔ اُس نے ایک بڑے خانہ دار رومال میں گلا صاف کیا۔ اس کا بلغم بڑی مشکل سے خارج ہوا۔ اُس نے دوسروں کو جگا دیا۔ چوکیدار نے کہا کہ اب جانا چاہئے۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑھیا نے تنگ ہو کر سٹری سی صورت بنائی مگر جانے سے پہلے سب نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ صرف ایک ہی رات میں جس کے دوران کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔ ہم سب کیونکر ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہو گئے ہیں۔

میں بہت تھکا ہوا تھا۔ چوکیدار مجھے اپنے یہاں لے گیا۔ وہاں میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر میں نے دُودھ کے ساتھ کافی پی جس سے میری تھکان کچھ کم ہوئی۔ باہر نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ پہاڑوں کے اُوپر جو مارنگو کو سمندر سے الگ کرتے تھے۔ دُور اُفق تک سُرخی ہی سُرخی پھیلی ہوئی تھی اور ہوا میں جو سمندر سے آ رہی تھی، نمک کی خوشبو تھی۔ میں ایک مدت کے بعد گاؤں میں آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اماں کا سلسلہ نہ ہوتا، تو آج یہاں سیر کرنے میں کتنا لطف آتا۔

لیکن میں صحن میں ایک درخت تلے انتظار کرتا رہا اور خنک زمین کی "تازہ اور سوندھی سوندھی مہک سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر میں نہ سویا۔ اب مجھے دفتر کے ساتھیوں کا خیال آیا کہ وہ اس وقت کام پہ جانے کے لئے اٹھے ہوں گے۔ میرے لئے ہمیشہ بستر سے اٹھنا وبال جان رہا ہے۔ میں نے ان باتوں پر ذرا اور غور کیا، لیکن بلڈنگ میں کسی گھڑی کی آواز نے میرے خیالات کا "تانتا توڑ دیا۔ کھڑکیوں کے پیچھے

کچھ شور ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ آسمان پر سورج ذرا اور اُبھرا اور میرے پاؤں گرم ہونا شروع ہو گئے۔ چوکیدار صحن سے گزر کر میرے پاس آیا اور کہا کہ ڈائریکٹر مجھے بلا رہا ہے۔ میں اس کے دفتر میں گیا۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا اور اُس کی پتلون لکیر دار تھی۔ وہ ہاتھ میں ٹیلیفون لئے ہوئے تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا:

"جنازہ بردار ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ میں انہیں کہنے والا ہوں کہ صندوق بند کر دیں مگر اس سے پہلے آپ چاہیں گے کہ اپنی والدہ کا آخری دیدار کر لیں۔"

میں نے کہا:

"نہیں ——!"

اُس نے آواز دھیمی کرتے ہوئے ٹیلیفون پہ حکم دیا:

"ان لوگوں کو کہہ دو کہ اب وہ جا سکتے ہیں۔"

پھر اُس نے مجھے بتایا کہ وہ جنازہ میں شامل ہوگا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بازو پر بازو دھرے اپنی میز پہ بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ جنازہ میں وہ اور صرف ایک نرس شامل ہوں گے۔ اُس نے کہا:

"اصولی طور پر پنشنر لوگوں کو جنازہ میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ صرف شب بھر میت کے پاس رَت جگا کر سکتے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا بھلا ہے۔"

اُس نے مزید کہا۔ مگر اُس نے خاص طور پر اماں کے ایک بوڑھے دوست کو اجازت دے دی ہے کہ وہ سب کے پیچھے پیچھے چل سکتا ہے۔ اس کا نام ٹامس پریز ہے۔ یہاں ڈائریکٹر مسکرایا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"آپ سمجھے کہ اس لگاؤ میں ذرا بچپن سا تھا۔ لیکن وہ اور آپ کی والدہ کبھی ایک

دوسرے سے جُدا نہیں ہوتے تھے۔ ہسپتال میں لوگ پیریز سے مذاق کیا کرتے تھے کہ یہ تمہاری منگیتر ہے؟ وہ ہنس دیتا تھا مگر اسے لطف بھی آتا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ مادام مرسو کی موت نے اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ جب میں نے اُسے جنازہ میں شمولیت کی اجازت دینے سے انکار کیا تو مجھے اس کی سنجیدگی کا یقین آیا۔ مگر ڈاکٹر کے مشورہ پر کل رات میں نے اسے میت کی نگہبانی کرنے سے منع کر دیا تھا۔"

ہم بہت دیر تک خاموش رہے۔ پھر وارڈن اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کہا:

"او! وہ مارنگو کا پادری آگیا۔ وہ وقت سے ذرا پہلے آپہنچا ہے۔"

اُس نے مجھے بتایا کہ گرجے تک جو گاؤں میں ہے خاصا پون گھنٹے کا سفر ہے۔ ہم نیچے اترے۔ باہر پادری اور گرجے کی بھی منڈلی کے دو لڑکے کھڑے تھے۔ ایک کے پاس دھونی دینے کا برتن تھا۔ پادری نقرئی زنجیر ٹھیک کرنے کے لئے اس کی طرف جھکا۔ ہمارے پہنچنے پر پادری میری طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے مجھے "بیٹا" کہہ کر پکارا اور چند لفظ کہے۔ وہ لاش گھر میں داخل ہوا اور میں اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

میں نے دیکھا کہ تابوت کے پیچ کس دیئے گئے ہیں اور اس کے پیچھے چار سیاہ پوش آدمی کھڑے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وارڈن نے مجھ سے کہا کہ مُردوں کی گاڑی سڑک پر انتظار کر رہی ہے۔ اس کے بعد تمام کام بہت تیزی سے ہوا۔ چار آدمی میت کے صندوق کی طرف ایک سیاہ غلاف لے کر بڑھے۔ پادری اس کے پیچھے تھا۔ وارڈن اور میں بھی باہر نکل آئے۔ دروازے کے ساتھ ایک عورت کھڑی تھی جسے میں نہیں جانتا تھا۔ وارڈن نے تعارف کرایا:

"موسیو مرسو۔۔۔!"

میں اس خاتون کا نام نہ سن سکا۔ صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ نرسوں کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اُس نے مسکرائے بغیر اپنا سوکھا سڑا لمبا چہرہ ہلا دیا۔ پھر ہم قطار میں کھڑے ہو گئے تاکہ میت گزر سکے۔ جنازہ برداروں کے پیچھے پیچھے ہم برآمدے سے ہوتے ہوئے سامنے کے دروازے تک پہنچے۔ وہاں جنازہ بردار گاڑی کھڑی تھی۔ مستطیل، صاف ستھری، سیاہ رنگ، چمکتی دمکتی ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے دفتر کے قلمدانوں کا مبہم سا خیال آیا۔ گاڑی کے پاس رئیس تشریفات تھا۔ ایک پست قد آدمی جس کی عادات مضحکہ خیز تھیں۔ اور اُس کے ساتھ ایک بوڑھا جو معلوم ہوتا تھا کہ کسی سے اپنا چہرہ ادھار مانگ کر لایا ہے۔ میں بھانپ گیا کہ یہ موسیو پیریز ہے۔ وہ فلیٹ ہیٹ پہنے ہوئے تھا جس کی ٹوپی گول اور اطراف چوڑے چوڑے تھیں۔ جب میت دروازے سے گزری تو اُس نے تعظیماً اپنی ٹوپی اتار دی۔ وہ ایک ایسا لباس پہنے ہوئے تھا جس میں پتلون کے پائنچے جوتوں پر بل دیئے جاتے ہیں۔ اس کی سفید قمیص کے بڑے کالر میں ایک چھوٹی سی کالے کپڑے کی بو ٹائی لگی ہوئی تھی۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اس کی ناک پر سیاہ دھبے نظر آ رہے تھے۔ اس کے گنج کے چند سفید بال جو خاصے پتلے تھے اس کے لٹکے ہوئے کانوں پر گر رہے تھے۔ اس کے کانوں کی سرخی اور اس کے چہرے کے پیلے پن میں عجیب تضاد تھا۔ رئیس تشریفات نے ہماری جگہیں مقرر کر دیں۔ سب سے آگے پادری اس کے پیچھے میت کی گاڑی جس کے ارد گرد چار آدمی تھے، ان کے پیچھے وارڈن اور میں اور سب کے پیچھے نرس اور موسیو پیریز۔

اب آسمان پر سورج بلند ہو چکا تھا۔ اس کی تپش تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مجھے

معلوم نہیں کہ ہم نے چلنے کی تیاری میں اتنا وقت کیوں لیا۔ مجھے اپنے گہرے رنگ کے کپڑوں میں بہت گرمی لگ رہی تھی۔ پست قد بوڑھے نے جواب قدرے سنبھل چکا تھا پھر سے اپنی ٹوپی اتاری۔ میں ذرا سا اس کی طرف بڑھا اور اسے دیکھنا شروع کیا۔ اس اثنا میں ڈائریکٹر نے اس کے متعلق مجھ سے کچھ کہا لیکن میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اکثر امی اور موسیو پریز ایک نرس کے ساتھ شام کو گاؤں تک ٹہلنے نکل جایا کرتے تھے۔ میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی اور منظر کا جائزہ لیا۔ سڑک کی ایک قطار آسمان کے قریب پہاڑوں تک جا رہی تھی۔ گرم گلابی اور سبز زمین، اِکا دُکا خوبصورت مکان ـــــ اب میں امی کو کچھ بہتر سمجھنے لگا۔ اس ملک میں شام ایک افسردہ خواب کی طرح معلوم ہوتی ہے۔ آج سورج جوبن پر تھا۔ لہٰذا سفر بہت تکلیف دہ اور بدمزہ رہا۔

آخرکار ہم نے چلنا شروع کر دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ پریز ہلکا ہلکا لنگڑا رہا ہے۔ میت گاڑی کی رفتار بتدریج تیز ہوتی گئی اور یہ بوڑھا پیچھے رہ گیا۔ ان آدمیوں میں سے بھی جو گاڑی کے گرد چل رہے تھے ایک پیچھے رہ گیا۔ اب وہ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ سورج کس تیز رفتاری سے آسمان پر بلند ہو رہا تھا۔ میں نے غور کیا کہ بہت دیر تک گاؤں کے گرد و نواح میں کیڑوں مکوڑوں کے گانے اور گھاس کی گرم سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے گالوں پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ چونکہ میرے پاس ٹوپی نہ تھی میں اپنے آپ کو رومال سے ہوا کرتا رہا۔ جنازہ بردار ملازم نے مجھ سے کچھ کہا مگر مجھے سنائی نہ دیا۔ ساتھ ہی اُس نے ایک رُومال سے جو اُس کے بائیں ہاتھ میں تھا اپنے سر سے پسینہ پونچھا۔ دائیں ہاتھ سے وہ تابوت کو کونے سے

تھامے ہوئے تھا۔

میں نے کہا "کیا ــ؟"

اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

میں نے پھر کہا "ہاں!"

اُس نے پوچھا "وہ سن رسیدہ تھیں؟"

میں نے بات ٹال دی کیونکہ مجھے ان کی صحیح عمر معلوم نہ تھی۔ اس کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ میں نے منہ موڑا تو دیکھا کہ بوڑھا پریز تقریباً پچاس گز ہم سے پیچھے رہ گیا ہے۔ اُس نے اپنی ٹوپی ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے اپنی رفتار تیز کی۔ میں نے ڈائریکٹر کو بھی دیکھا۔ وہ بہت وقار سے چل رہا تھا بغیر کوئی نازیبا حرکت کیے ہوئے۔ اس کے ماتھے پر بہت پسینہ بہہ رہا تھا مگر اُس نے نہ پونچھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری رفتار اب ذرا تیز ہو گئی ہے۔ سورج کی تپش کیا تھی آگ برس رہی تھی۔ گرمی اب ناقابل برداشت ہو گئی۔ ہم سڑک کے اسی حصہ سے گزرے جس کی حال ہی میں مرمت ہوئی تھی۔ سورج کی شعاعوں سے کولتار چمک رہی تھی۔ اس میں ہمارے پاؤں دھنس گئے۔ جب ہم نے زور سے انہیں کھینچا تو جوتوں کے ساتھ کولتار بھی اکھڑ آئی۔ ڈرائیور کی کالی ٹوپی گائے کے چمڑے کی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی کولتار میں اَٹی پڑی تھی۔ میں نیلے اور سفید آسمان کے تلے رنگوں کے امتزاج میں کھو سا گیا ـــــ کولتار کا رنگ کالا، ماتمی لباس سیاہ رنگ کا، گاڑی کا رنگ کالا چمکتا ہوا۔ یہ سب چیزیں ـــــ سورج، چمڑے کی بو، گاڑی کے گھوڑوں کی لید، دھونی کا دھواں، رت جگے کی تکان ـــــ یہ سب اذیت کا باعث تھیں اور میرے خیالات پریشان ہو رہے تھے۔ میں نے ایک دفعہ پھر مڑ کر دیکھا۔ پریز

مجھے دُور معلوم ہو رہا تھا۔ گرمی اور گرد کی دھندلاہٹ میں کھویا ہوا۔ میری نظروں نے اُسے بہت ڈھونڈا مگر پھر میں اُسے نہ دیکھ سکا۔ میں نے سوچا کہ اُس نے سڑک سے ہٹ کر کھیتوں کی راہ لے لی ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ذرا آگے ہمارے سامنے سڑک کا موڑ تھا۔ میں سمجھا کہ پریز جو اس علاقے کو خوب جانتا ہے رستہ کاٹ کر ہم سے اگلے موڑ پر آملے گا۔ چنانچہ یہی ہوا مگر وہ پھر غائب ہو گیا۔ وہ دو مرتبہ کھیتوں کے پار گیا اور کئی دفعہ اُس نے یہی حرکت کی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ خون کی حدّت سے میری کنپٹی پھٹی جا رہی ہے۔ اس کے بعد کے واقعات کچھ اس رفتار سے گزرے کہ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ صرف ایک بات یاد ہے، وہ بات جو زِس نے مجھ سے گاؤں میں داخل ہوتے ہوئے کہی تھی۔ اس کی آواز عجیب و غریب تھی اور اس کی کچھ نسبت اُس کے چہرے سے نہ تھی۔ ایک لرزتی ہوئی سُریلی آواز — اُس نے مجھ سے کہا تھا:

"اگر انسان آہستہ چلے تو لُو لگ جانے کا خطرہ ہے اور اگر تیز چلے تو پسینے سے ہلکان ہو جاتا ہے اور گرجے کی ٹھنڈی ہوا میں زکام ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔"

وہ بات پتہ کی کر گئی۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ میرے ذہن میں اس سفر کے کچھ خاکے محفوظ ہیں۔ مثلاً پریز کا چہرہ جب وہ آخری دفعہ ہم سے گاؤں کے قریب آن ملا۔ دکھ درد کے آنسو اُس کی گالوں سے ٹپک رہے تھے۔ مگر چہرے کی گہری جھریوں نے انہیں بہنے نہ دیا۔ وہ آنسو ٹپکے مگر بہہ نہ سکے۔ صرف پھیل گئے اور پھر مل کر اس کے ویران چہرے پر انہوں نے پانی کی ایک چمک پیدا کر دی۔ پھر میرے حافظے میں وہاں کا گرجا محفوظ ہے۔ سڑک کے دو رویہ گاؤں کے لوگ، قبرستان میں قبروں پر جرنیم کے سُرخ پھول، پریز کا بیہوش ہو جانا (بلکہ یوں کہیے کہ کٹھ پتلی کا گر پڑنا) خون رنگ زمین جو

امّی کی لاش پر کود رہی تھی — سفید جڑیں مٹی میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ پھر لوگوں کا نقشہ۔ ان کی آوازیں، گاؤں، قہوہ خانے کے سامنے بس کی انتظار میں ہمارا رُکنا۔ موٹر کے مسلسل خراٹے اور اس کے بعد میری خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔ جب ہماری بس الجیر کی روشنیوں کے تانے بانے میں گھسی اور میں نے سوچا کہ آخر کار اب میں پورے بارہ گھنٹے تک پاؤں پسار کر سو سکوں گا۔

بھی —— مگر کچھ عرصہ بعد وہ چلی گئی اور ہمیں زیادہ موقع نہ ملا۔

میں نے اُسے سہارا دیا اور وہ پیراکی کے ایک تختہ پر سوار ہو گئی۔ ایسے میں اُس کی چھاتیاں مجھ سے چھُو گئیں۔ میں پھر پانی میں کودا۔ وہ پیراک تختے پر پیٹ کے بل لیٹی رہی اُس نے میری طرف کروٹ لی۔ اُس کے بال آنکھوں پر پریشان تھے اور وہ ہنس رہی تھی میں پیراک تختہ پر اُس کے قریب جا پہنچا۔ موسم اچھا تھا۔ مذاق مذاق میں میں نے اپنا سر پیچھے پھینک دیا اور اس کے پیٹ پر ٹیک دیا۔ اُس نے کچھ نہ کہا اور میں اسی حالت میں وہاں لیٹا رہا۔ سورج میری آنکھوں پر پڑ رہا تھا اور فضا نیلی نیلی اور سنہری تھی۔ میں نے اپنی گردن کے نیچے محسوس کیا کہ ماری کا پیٹ آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے ہم بہت عرصہ نیم خوابی کی حالت میں پیراک تختے پر لیٹے رہے۔ جب دھوپ بہت تیز ہو گئی تو وہ پانی میں کود پڑی۔ اور میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ میں نے اُسے پھر پکڑ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اُس کی کمر کے گرد ڈالا اور ہم اکٹھے تیرتے رہے۔ وہ سارا وقت ہنستی رہی۔ جب ہم کنارے پر اپنا بدن سکھا رہے تھے تو اُس نے مجھ سے کہا:

"میں تم سے زیادہ سنولا گئی ہوں"

میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ شام کو میرے ساتھ سینما چلے گی؟ وہ پھر ہنسی اور مجھ سے کہا کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ فرنانڈل کی کوئی مذاقیہ فلم دیکھے۔ جب ہم کپڑے بدل چکے تو وہ مجھے کالی ٹائی پہنے ہوئے دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں سوگ منا رہا ہوں؟ میں نے اُسے بتایا کہ امی فوت ہو گئی ہے۔ چونکہ وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کب کا واقعہ ہے۔ میں نے جواب دیا:

"کل کا ——"

(۲)

سویرے جو آج آنکھ میری کھلی تو میں سمجھا کہ میرا افسر آخر ناراض سا کیوں تھا جب میں نے اُس سے دو روز کی رخصت مانگی۔ آج سنیچر ہے۔ یوں کہئے کہ میں یہ بھول ہی گیا تھا۔ لیکن اٹھتے ہی مجھے یہ خیال آیا۔ صاحب نے طبعی طور پر سوچا ہوگا کہ اتوار ملا کر میری چار چھٹیاں بن جائیں گی اور یہ امر اس کے لئے کچھ باعثِ مسرت تو نہ ہو سکتا تھا لیکن یہ میری غلطی تو نہ تھی کہ انہوں نے امی کو آج کی بجائے کل دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہر حال مجھے ہفتہ اور اتوار کی چھٹی تو ملنا ہی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے صاحب کا نکتہ خیال سمجھنے میں کوئی دقت نہ پیش آئی۔

میں کل کے سفر سے ہلکان ہو رہا تھا۔ اسی لئے اٹھنے میں خاصی کوفت ہوئی۔ داڑھی مونڈتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آج مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ تیرنے چلا جائے۔ میں نے بندرگاہ کے حوضوں کی طرف جانے والی ٹرام پکڑی وہاں پہنچ کر جو نہی میں آب ریز میں کودا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں بہت سے نوجوان لوگ پہلے سے موجود تھے۔ پانی ہی میں ماری کاردونا سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ میرے دفتر میں سکریٹری کا کام کیا کرتی تھی۔ ایک زمانہ میں مجھے اُس سے اُنس تھا اور میں سوچتا ہوں کہ اُسے

وہ ذرا سی جھجکی مگر پھر اُس نے کچھ نہ کہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہوں کہ یہ میرا تو قصور نہیں ہے مگر میں نے اپنے آپ پر ضبط کیا کیونکہ مجھے خیال آیا کہ یہ بات تو میں پہلے ہی اپنے افسر سے کہہ چکا ہوں۔ اب تو اس کے کوئی معنی نہیں رہے۔ بہر حال انسان ہمیشہ قصوروار ہوتا ہی ہے۔

شام تک ماری سب کچھ بھول چکی تھی۔ فلم کے کچھ حصے مذاقیہ تھے مگر باقی خاصی مہمل تھی۔ اس کا بازو میرے بازو کے گرد تھا۔ میں اُس کی چھاتیاں چھو رہا تھا۔ فلم ختم ہونے پر میں نے اس کا بوسہ لیا مگر بُری طرح سے۔ فلم کے بعد وہ میرے یہاں آ گئی۔ جب میری نیند کھلی تو ماری جا چکی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے اپنی خالہ کے یہاں جانا ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ آج اتوار کا دن ہے۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ کوفت ہوئی۔ مجھے اتوار کا دن پسند نہیں۔ میں پھر بستر میں لوٹ گیا۔ تکیہ میں مجھے نمک کی اس خوشبو کی تلاش تھی، جو ماری کے بال وہاں چھوڑ گئے تھے۔ میں صبح دس بجے تک سوتا رہا۔ پھر دوپہر تک لیٹے لیٹے سگریٹ پیتا رہا۔ معمول کے خلاف آج میں سیلسٹ کے یہاں کھانا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے سوال کرے گا اور مجھے یہ پسند نہیں۔ میں نے اپنے لئے انڈے تلے اور اسی پلیٹ میں انہیں روٹی کے بغیر کھا گیا۔ گھر میں روٹی نہیں تھی اور میں روٹی لینے نیچے نہیں جانا چاہتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں بور سا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ جب امی یہاں تھیں تو گھر میں ہر طرح آرام تھا۔ اب میری ضروریات کے لئے یہ بہت بڑا ہے۔ مجھے چاہئے کہ کھانے کی میز کھانے کے کمرے سے اپنے کمرہ میں اٹھا لاؤں۔ میری زندگی صرف اسی کمرہ میں گزرتی ہے۔ کرسیوں کی حالت خستہ ہے۔ الماری کا شیشہ پیلا پڑ گیا ہے۔

یہاں ایک سنگار میز اور ایک تانبے کا پلنگ پڑا ہوا ہے۔ باقی سب چیزیں میرے لئے ناکارہ ہیں۔ کچھ دیر بعد وقت گزارنے کے لئے میں نے ایک پُرانا رسالہ اٹھا لیا اور اسے پڑھتا رہا۔ میں نے اس میں سے اشتہار کاٹا اور اپنی پُرانی کاپی میں چپکا دیا۔ میں اس کاپی میں اخبارات کے مختلف تراشے اپنی دلچسپی کے لئے جمع کیا کرتا تھا۔ میں نے ہاتھ منہ بھی دھو لیا اور آخر بالکونی میں جا بیٹھا۔

شہر کے نواح میں میرا کمرہ ایک شاہراہ پر تھا۔ سہ پہر کو موسم اچھا تھا۔ مگر پتھر کی سڑک ناہموار تھی۔ لوگ خال خال نظر آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہیں۔ ایک پورا خاندان چہل قدمی کی غرض سے نکلا تھا۔ دو چھوٹے بچے عنابی رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ نیکر گھٹنوں کے اُوپر تک۔ نئے کپڑوں میں ذرا اکڑا اکڑ کر چل رہے تھے۔ ایک بچی بڑی سی گلابی ٹائی لگائے ہوئے تھی۔ اُس کے کالے جُوتے پالش سے خوب چمک رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کی موٹی ماں قرمزی رنگ کے ریشمی لباس میں اور باپ ایک دُبلا پتلا پست قد آدمی جس کو میں صرف صورت سے پہچانتا تھا۔ اس کی بو ٹائی تتلی کی صورت تھی اور اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس کو اپنی امی کے ساتھ دیکھ کر ہی سمجھ میں آتا تھا کہ اس علاقہ کے لوگ کیوں اسے ایک شاندار آدمی کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد محلے کے نوجوان لڑکے سڑک سے گزرے۔ بالوں میں تیل لگا ہوا تھا۔ لال رنگ کی نکٹائیاں پہنے ہوئے۔ کوٹ بہت چست جن پر کشیدہ کاری ہو رہی تھی اور جُوتے سامنے سے مربع شکل کے۔ میں نے سوچا کہ وہ مرکز کے سینما میں جا رہے ہیں۔ اس لئے وہ تیزی سے ٹرام کی طرف جا رہے تھے اور خوب زور زور سے ہنس رہے تھے۔

ان کے جانے کے بعد سڑک آہستہ آہستہ سنسان ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ فلم

شو ہر جگہ شروع ہو چکے تھے۔ اب شاہراہ پر صرف بلیاں اور خوانچے والے رہ گئے تھے مطلع صاف تھا۔ انجیر کے درختوں پر جو دورویہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے تھے سورج زیادہ نہیں چمک رہا تھا۔ گلی کے اس پار سڑک کی پٹڑی پر تمباکو فروش نے بند کرسی نکالی۔ اسے کھول کر اپنے دروازے کے پاس رکھ دیا۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر کرسی کی پشت پر بازو رکھ کر ڈٹ گیا۔ ٹرام جو عموماً لوگوں سے کھچا کھچ بھری رہتی تھی اب تقریباً خالی تھی۔ ایک چھوٹے سے قہوہ خانہ میں جو تمباکو فروش کے بازو میں تھا ایک لڑکا خالی دکان میں جھاڑو دے رہا تھا۔ یہ واقعی خاصا اتوار کا دن تھا۔

میں نے اپنی کرسی کا رُخ پھیرا اور اس کو تمباکو فروش کی کرسی کی طرح اٹھا رکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یوں وہ زیادہ آرام دہ تھی۔ میں نے دو سگریٹ پیئے۔ چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا لینے کے لئے اندر گیا اور کھڑکی ہی میں اُسے کھانے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کالا آسمان تاریک ہو گیا اور میں نے سوچا کہ گرمیوں کی آندھی چلنے والی ہے۔ مگر بادل آہستہ آہستہ چھٹ گئے۔ بھاگتے ہوئے بادلوں کا سایہ سڑک پر پڑتا تو تاریکی چھا جاتی۔ اب بارش کی امید کم تھی۔ میں بہت دیر تک آسمان کو تکتا رہا۔ پھر پانچ بجے ٹرامیں زناٹے سے آ پہنچیں۔ وہ شہر کے باہر والے سٹیڈیم سے تماشائیوں کے جھنڈ کے جھنڈ لاد کر لا رہی تھیں۔ پیچھے آنے والی ٹرامیں کھلاڑیوں کو واپس لا رہی تھیں۔ وہ خوب چلّا رہے تھے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے اور اپنی ٹیم کے لئے زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ بہتوں نے مجھے اشارے کئے۔ ایک چلّایا:

"ہم جیت گئے۔"

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"شاباش!"

اس کے بعد بہت سی ذاتی موٹریں بھی چلنا شروع ہو گئیں۔

دن ذرا ڈھل گیا۔ اُفق پر سُرخی پھیلنے لگی اور شام ہوتے ہی سڑکوں پر چہل پہل شروع ہو گئی۔ لوگ پھر آہستہ آہستہ مٹرگشت کرنے لگے۔ منجملہ اور لوگوں کے میں نے اس شاندار شخصیت کو بھی دیکھا۔ اُن کے بچے پیچھے پیچھے گھسٹتے اور روتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس وقت علاقے کے سینما خالی ہوئے اور تماشائیوں کا ایک طوفان سڑکوں پر نمودار ہوا۔ نوجوان لڑکے حسبِ معمول بڑے زور سے ایک فیصلہ کُن انداز میں اشارے کر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ کوئی مار پٹائی والی فلم دیکھ کر آئے ہیں۔ جو لوگ انواع کے سینما سے لوٹے تھے وہ ذرا دیر سے پہنچے۔ وہ بہت متین اور سنجیدہ معلوم ہو رہے تھے۔ کچھ کبھی کبھار ہنستے بھی تھے تو تھکے ہوئے انداز میں۔ وہ لوگ گم سم نظر آ رہے تھے۔ وہ میرے سامنے کی سڑک پر آگے پیچھے ٹہلنے لگے۔ علاقے کی نوجوان لڑکیاں بال لمبے کئے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ٹولیاں بنا کر ٹہل رہی تھیں۔ چند نوجوان لڑکوں نے ان کی راہ روکی اور کچھ فقرے کسے۔ اس پر چند لڑکیاں سر ہلا ہلا کر ہنسیں۔ ان میں سے دو ایک نے جنہیں میں پہچانتا تھا میری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلائے۔

اب سڑک پر چراغ تیزی سے روشن ہوئے۔ بتیاں جلتے ہی آسمان کے ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور سڑک کی روشنیاں دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں تھک گئی ہیں۔ بھیگی ہوئی سڑک روشنی سے چمک رہی تھی۔ ٹراموں کی سامنے کی روشنی کبھی چمکتے بالوں پر پڑتی۔ کبھی کسی کی مسکراہٹ پر اور کبھی نقرئی چوڑیوں پر۔ تھوڑی دیر بعد ٹرامیں کم ہونے لگیں۔ سیاہ رات درختوں اور سڑک کے چراغوں پر چھا گئی۔ یہ علاقہ

بالکل ویران تھا۔ یہاں تک کہ بتی سنسان سڑک پر بڑے آرام سے جلنے لگی۔ میں نے پھر سوچا کہ اب کھانا کھانا چاہیے؛ میری گردن میں ذرا بل پڑ گیا تھا کیونکہ میں بہت دیر تک کرسی کی پشت پر سر جھکا کر بیٹھا رہا تھا۔ روٹی خریدنے نیچے اترا۔ میں نے کھانا پکایا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے کھا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ کھڑکی میں بیٹھ کر سگریٹ پیوں مگر ہوا سرد تھی اور مجھے کچھ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی میں نے کھڑکیاں بند کر دیں اور لوٹتے ہوئے میں نے آئینے میں دیکھا کہ میری لالٹین میز کے کنارے روٹی کے چند ٹکڑوں کے ساتھ پڑی ہوئی ہے۔

مجھے خیال آیا کہ خدا خدا کر کے آخر اتوار ختم ہوا۔ اتوار ہمیشہ ایسے ہی ختم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ اب امّی کو دفن کر دیا گیا ہے اور مجھے اب حسب معمول پھر سے کام کو لوٹنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ دنیا کے کام کبھی بند نہیں ہوتے اور زندگی کے کاروبار میں کوئی تغیر نہیں آتا۔

۳

آج میں نے دفتر میں بہت کام کیا۔ میرا افسر اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں زیادہ تھکا تو نہیں ہوں؟ اس نے امّی کی عمر بھی پوچھی۔ میں نے کچھ سوچا اور کہا تقریباً ساٹھ برس تاکہ بیان میں غلطی نہ رہے۔ مجھے وجہ تو معلوم نہیں مگر آج اس کا رویہ بڑی ہمدردی اور غم خواری کا تھا اور انداز کچھ یوں تھا کہ اب ماضی کو خیر باد کہہ جائے۔

اس کے پاس مثلوں کا ایک انبار تھا جو اس نے میز پر ڈھیر کر دیا۔ ضروری تھا کہ میں ان سب سے نپٹوں۔ دوپہر کے کھانے پر جانے سے پہلے میں نے ہاتھ دھوئے۔ دوپہر کا یہ وقت مجھے بہت پسند ہے۔ شام کو لطف کم آتا ہے کیونکہ گھومنے والا تولیہ جو سبھی استعمال کرتے ہیں بالکل گیلا ہو جاتا ہے۔ وہ سارا دن جو استعمال ہوتا رہتا ہے۔ میں نے اپنے افسر سے ایک روز اس کا تذکرہ بھی کیا۔ اس نے مجھے جواب دیا کہ اس کے نزدیک یہ بات اچھی تو نہیں مگر بہر حال ایک غیر اہم تفصیل ہے۔ میں معمول سے ذرا دیر سے نکلا۔ ساڑھے بارہ بجے، امینول کے ساتھ جو جہاز پر مال چڑھانے کا کام کرتا تھا۔ دفتر سمندر کے کنارے تھا۔ بندرگاہ میں جو دھوپ میں تپ رہی تھی، ہم نے کچھ وقت لدا ہوا مال دیکھنے

میں ضائع کیا۔ اس لمحہ ایک بڑی لاری زنجیروں اور انجن کے دھماکوں کا شور و غل کرتی ہوئی آ پہنچی۔ امینول نے مجھ سے پوچھا:

"چلو گے اس پر؟"

اور میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ لاری ہمارے پاس سے گزری تو ہم نے اس کا تعاقب کیا۔ میں شور، گرمی اور گرد کی لپیٹ میں آ گیا۔ مجھے اب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا صرف راستے کے نشیب و فراز اور لاری کے دھچکے محسوس ہو رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے اُفق پر ناچ رہے تھے اور بادبانی کشتیاں تیزی سے ہمارے پاس سے گزر رہی تھیں۔ میں نے پہلے تو ٹرک کو پیچھے سے جا لیا اور پھر ایک چھلانگ لگا کر اس میں سوار ہو گیا اور پھر میں نے امینول کو اُوپر کھینچ لیا۔ ہمارا سانس پھولا ہوا تھا۔ ٹرک گھاٹ کی ناہموار پتھریلی سڑک پر اچھل رہا تھا۔ گرمی بہت تھی اور مٹی خوب اُڑ رہی تھی۔ امینول کا ہنسی کے مارے دم رُک گیا۔

ہم پسینہ میں شرابور سلیسط کے ریستوران میں پہنچے۔ وہ ہمیشہ دروازے کے ساتھ اپنی خاص جگہ پر کھڑا ہوتا، توند نکالے ہوئے، جھاڑن پکڑے ہوئے اور اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا:

"کھانا لگا دوں؟"

میں نے کہا:

"ہاں! مجھے بھوک لگی ہوئی ہے!"

میں نے بہت جلدی سے کھانا کھایا اور آخر میں قہوہ پیا۔ پھر میں اپنے یہاں لوٹا۔ میں نے دم بھر قیلولہ کیا کیونکہ میں انگور کی شراب ذرا زیادہ پی گیا تھا۔ اٹھتے ہی مجھے

سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دیر ہو چکی تھی اور میں ٹرام پکڑنے کو بھاگا۔ سہ پہر بھر میں نے کام کیا۔ دفتر میں بڑی گرمی تھی۔ شام کو نکلتے ہوئے گھاٹ کے کنارے چہل قدمی کرنے کا مجھے خوب مزہ آیا۔ آسمان سبز تھا اور میں بڑے اطمینان سے تھا۔ پھر بھی میں سیدھا گھر آیا کیونکہ مجھے اُبلے ہوئے آلو پکانا تھے۔

ہال میں اندھیرا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بڈھے سلمانو سے میری مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ میرا ہمسایہ تھا۔ اس کا کتا حسبِ معمول اس کے ساتھ تھا۔ آٹھ برس سے میں انہیں باہم دیکھ رہا ہوں۔ سلمانو کا سپنیل کتا بہت بھدا تھا۔ اس کو جلد کی کوئی بیماری تھی۔ میرے خیال میں اس کو خارش تھی جس کی وجہ سے اس کے سارے بال جھڑ رہے تھے۔ اس کے زخموں پر گندمی رنگ کا کھرنڈ آ رہا تھا۔ دونوں کا ایک ساتھ ہی چھوٹے سے کمرہ میں رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بوڑھا سلمانو بھی اپنے ساتھی کا ہم شکل نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے پر سُرخی مائل کھرنڈ آ رہا تھا اور سر کے بال بہت کم اور پیلے پڑ رہے تھے۔ کُتے نے اپنے مالک سے ایک طرف جھک کر چلنے کا انداز سیکھ لیا تھا۔ تھوتھنی آگے ٹکی ہوئی اور گردن تنی ہوئی۔ دونوں ایک ہی نسل کے معلوم ہوتے تھے۔ مگر دونوں کو ایک دوسرے سے آگ پانی کا بیر تھا۔ روزانہ دو بار، گیارہ بجے اور چھ بجے بڈھا کتے کو بلا ناغہ گھمانے لے جاتا۔ آٹھ برس سے اُنہوں نے اپنا یہ معمول نہ بدلا تھا۔ ہر روز آدمی انہیں ۲۵۷۷ کی سڑک کے کنارے دیکھ سکتا تھا۔ کتا اسے زور سے گھسیٹتا جاتا۔ حتیٰ کہ بوڑھے کے قدم ڈگمگا جاتے اور اُسے ٹھوکر لگتی۔ پھر وہ کُتے کو پیٹتا اور گالیاں بکنے لگتا۔ کتا ڈر سے سہم جاتا اور وہ اُسے گھسیٹنے لگتا۔ اب بڈھا کُتے کو کھینچتا۔ جب کتا بھول جاتا کہ اُس کی کیا گت بنی ہے وہ پھر اپنی حرکت شروع کر دیتا اور بڈھا پھر اُسے پیٹتا اور گالیاں بکتا۔ پھر وہ دونوں پیدل چلنے

والوں کے راستے پر کھڑے ہو جاتے اور ایک دوسرے کو گھورنے لگتے ـــ کتا خوف سے اور آدمی نفرت سے۔ ہر روز یہی تماشا ہوتا۔ جب کتا کھمبے کے ساتھ پیشاب کرنا چاہتا بڈھا اُسے رُکنے نہ دیتا۔ وہ اسے گھسیٹتا اور بے چارہ کتا چلتے چلتے پیشاب کرتا اور قطروں کی قطار بناتا چلا جاتا اور اگر اتفاق سے وہ کبھی یہ حرکت کمرے میں کر بیٹھتا تو پھر سے پٹتا۔ آٹھ برس سے یہی سلسلہ جاری تھا۔ سلیط ہمیشہ کہتا:

"یہ بڑی بدبختی ہے۔"

مگر اس بات کی تہ کو کوئی نہ پہنچ سکا۔

جب سیڑھیوں میں اُس سے میری ٹکر ہوئی تو سلمانو اپنے کتے کو بُرا بھلا کہنے میں مشغول تھا۔ وہ اسے کہہ رہا تھا:

"حرامی ـــ سور!"

اور کتا رو رہا تھا۔ میں نے آداب عرض کیا لیکن بڈھا مسلسل گالیاں بکتا رہا۔ پھر میں نے پوچھا کہ آخر کتے نے اُس کا کیا بگاڑا ہے۔ مگر اُس نے پھر جواب نہ دیا۔ وہ صرف یہی کہتا رہا ـــ "حرامی ـ سور!"

میں نے دیکھا کہ وہ کتے پر جھکتے ہوئے اُس کے پٹے کی کوئی چیز ٹھیک کرنے لگا ہے۔ میں نے اُسے اور بلند آواز سے پکارا تو میری طرف مڑے بغیر اُس نے ایک دبے ہوئے غصّے سے کہا:

"یہ ہمیشہ رستے میں آدھمکتا ہے۔"

پھر وہ جانور کو کھینچتے ہوئے اُوپر چلا گیا۔ کتا اپنے چاروں پاؤں پر گھسٹتے گھسٹتے بلک رہا تھا۔ عین اسی وقت ہماری منزل پر رہنے والا دوسرا ہمسایہ نمودار ہو گیا۔ علاقے کے

لوگ کہتے تھے کہ وہ عورتوں کی آمدنی پر گزارا کرتا ہے۔ جب کوئی اُس سے پوچھتا کہ اس کا پیشہ کیا ہے تو وہ کہتا:

"دکان داری!"

عموماً وہ مشکل سے ہی کسی کو خاطر میں لاتا تھا لیکن وہ مجھ سے اکثر باتیں کیا کرتا۔ اور کبھی کبھار کچھ وقت میرے یہاں گزارتا کیونکہ میں اُس کی باتیں سن لیتا تھا۔ درحقیقت وہ مجھے بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال کوئی ایسی وجہ نہ تھی کہ میں اُس سے بات نہ کرتا۔ اس کا نام رامون تھا۔ وہ خاصا پست قد تھا۔ اُس کے کندھے چوڑے چکلے تھے اور اُس کی ناک گھونسا بازی کرنے والوں کی طرح چپٹی تھی۔ اس کا لباس ہمیشہ موزوں ہوتا۔ سلمانو کا تذکرہ کرتے ہوئے اُس نے بھی مجھ سے کہا تھا:

"کیا یہ بڑی بدبختی نہیں ہے کہ وہ کتے سے یوں سلوک کرتا ہے!"

اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اس کی وجہ سے مجھے کوفت تو نہیں ہوتی؟ میں نے کہا نہیں! ہم ایک ساتھ سیڑھیوں پر چڑھے اور میں اس سے اجازت لینے ہی والا تھا کہ اُس نے کہا:

"میرے یہاں کچھ خورد و نوش کا سامان ہے۔ ایک نوالہ کھائیں گے آپ میرے ساتھ؟"

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کھانا پکانے کی مصیبت ٹل جائے گی ہاں کر دی۔ اُس کے پاس بھی ایک ہی کمرہ تھا جس میں کھڑکی بغیر ایک باورچی خانہ تھا۔ اُس کے پلنگ کے اُوپر دیوار پر ایک فرشتہ سفید اور گلابی گچ کا بنا ہوا ٹنگ رہا تھا۔ کچھ پہلوانوں کی تصویریں اور دو تین ننگی عورتوں کے تراشے۔ کمرہ کثیف تھا اور بستر لگا ہوا نہیں تھا۔ اُس

نے پہلے اپنا تیل والا لیمپ جلایا۔ پھر وہ خاصے شک و شبہ سے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اُس نے ایک میلی سی پٹی نکالی اور دائیں ہاتھ کو لپیٹ لی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اُس کی لڑائی ایک ایسے لڑاکے سے ہوئی ہے جس کا ذکر کہانیوں میں آتا ہے۔

"آپ سمجھتے ہیں موسیو مرسو!" اُس نے مجھ سے کہا، "اس لئے نہیں کہ میں نے کوئی شرارت کی تھی بلکہ اس لئے کہ میرا خون گرم ہے۔ اُس آدمی نے دُور سے مجھے للکارا:

"ٹرام سے نیچے اُتر اگر تو مرد ہے۔"

میں نے کہا:

"بس چلتا بن اور ہوش کے ناخن لے۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔"

اُس نے طعنہ دیا کہ میں مرد نہیں ہوں۔ پھر میں ٹرام سے نیچے اترا اور اُس سے کہا:

"بہتر ہے اب بس کرو ورنہ میں تمہاری جان مار دوں گا۔"

اُس نے کہا:

"کیا ——؟"

پھر میں نے اُس کے منہ پر ایک چپت رسید کی۔ وہ گر پڑا۔ میں اُسے اٹھانے لگا مگر اُس نے لیٹے لیٹے میرے پیٹ میں لاتیں ماریں۔ اس پر میں نے اُسے ایک گھٹنا دیا اور دو گھونسے مارے۔ اس کا چہرہ —— لہو لہان ہو گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ کیا اُس کا حساب چک گیا ہے یا نہیں؟

اُس نے کہا — "ہاں!"

ساری بات کے دوران ریموں پٹی ٹھیک کرتا رہا۔ میں پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ نے دیکھا میں نے اُس کا پیچھا نہیں کیا بلکہ وہ میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔" اُس نے مجھ سے کہا۔

میں نے سر ہلا دیا۔ پھر اُس نے کہا:

"یہ سچ بات تھی اور میں اُسے پہچانتا تھا۔"

پھر اُس نے اعلان کیا کہ دراصل اس معاملہ میں وہ میری رائے معلوم کرنا چاہتا ہے کیونکہ میں ایک جہاندیدہ آدمی ہوں اور اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ پھر وہ فوراً ہی میرا یارِ غار بن جائے گا۔ میں چُپ رہا اور اُس نے تکرار سے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کا ہم نوالہ ہم پیالہ بننا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا:

"میرے لئے سب برابر ہے۔"

وہ مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کالا حلوہ نکالا۔ اُسے کڑھائی میں بنایا اور گلاس پلیٹ اور انگور کی شراب کی دو بوتلیں میز پر لگا دیں، سب خاموشی سے۔ پھر ہم جم کر بیٹھ گئے کھانا کھاتے ہوئے اُس نے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔ پہلے وہ کچھ جھجکا۔

"میں ایک عورت کو جانتا ہوں۔ یوں کہئے کہ وہ میری داشتہ ہے۔" وہ آدمی جس سے اس کی لڑائی ہوئی تھی اس عورت کا بھائی تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی مالی امداد کرتا ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تو اُس نے فوراً کہا:

"علاقے میں لوگ جو باتیں بناتے ہیں اُسے سب معلوم ہیں مگر اُس کا اپنا ضمیر بھی ہے اور یہ صحیح ہے کہ وہ دکانداری کرتا ہے۔"

"آمدم برسرِ مطلب!" اُس نے مجھ سے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

"میں اُسے گزارے کی رقم دیتا ہوں ۔ اس کے کمرے کا کرایہ بھی ادا کرتا ہوں ۔ اور اسے روزانہ ۲۰ فرانک کھانے کا خرچ دیتا ہوں ۔ کمرے کے تین سو فرانک ، چھ سو فرانک خوراک کے ، اگا ہے گا ہے جرابوں کا ایک جوڑا —— یہ ہوئے ہزار فرانک ۔ اور مادام کوئی کام ہی نہیں کرتی ۔ مجھ سے کہتی ہے کہ ہونا بھی یونہی چاہئے ۔ میں جو اسے دیتا ہوں اس پر اُس کا گزارہ نہیں ہوتا ۔ مگر میں نے اُس سے کہا کہ پھر تم آدھے دن کے لئے کوئی کام کیوں نہیں کر لیتیں ۔ اس طرح سب چھوٹی چھوٹی فکروں سے میرا چھٹکارا ہو جائے گا ۔ اس مہینے میں نے تمہیں ایک لباس خرید کر دیا ہے ۔ میں تمہیں روزانہ ۲۰ فرانک دیتا ہوں ۔ میں تمہارا کرایہ ادا کرتا ہوں اور تم —— اپنے دوستوں کے ساتھ ساری سہ پہر قہوہ اڑاتی ہو ۔ تم انہیں قہوہ اور شکر دیتی ہو ۔ میں تمہیں مال دیتا ہوں ۔ میں تمہارے ساتھ نیکی کرتا ہوں اور اس کے بدلہ میں تم میرا برا چاہتی ہو ۔ مگر وہ کوئی کام کاج نہیں کرتی اور ہمیشہ کہتی ہے اس سے یہ دھندہ نہیں ہوتا ۔ اس سے مجھے شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو کچھ گڑبڑ ہے ۔"

اُس نے پھر مجھے بتایا کہ اُسے لڑکی کے بیگ میں ایک لاٹری کا ٹکٹ ملا ۔ اور وہ اُسے خاطر خواہ جواب نہ دے سکی کہ اُس نے یہ کیونکر خریدا ہے ۔ تھوڑی دیر بعد اُسے گھر میں یہ ثبوت بھی ملا کہ اُس نے دو چوڑیاں گروی رکھ دی تھیں ۔ اب تک تو اُس نے چوڑیوں کے وجود کو ہی نظر انداز کر رکھا تھا مگر اب مجھے صاف نظر آیا کہ سب دھوکا ہے ۔ پھر میں نے اُسے چھوڑ دیا مگر اس سے پہلے میں نے اُسے پیٹا اور خوب صلواتیں سنائیں ۔ میں نے کہا تو صرف اپنے فلاں ٹھگ سے عیش کرنا چاہتی ہے ۔ آپ سمجھتے ہیں موسیو مرسو کہ میں نے اُسے یہ کیونکر کہا :

"تم نہیں جانتیں کہ دنیا تمہاری خوش نصیبی پر جو تمہیں میری وجہ سے حاصل ہے کس قدر رشک کرتی ہے ۔ تمہیں بعد میں پتہ چلے گا کہ تم کتنی خوش نصیب ہو ۔"

اُس نے عورت کو مار مار کر ہلکان کر دیا ۔ پہلے وہ اسے پیٹتا نہیں تھا ۔

"یوں کہئے کہ میں اُسے مارتا تو تھا مگر پیار سے ۔ وہ تھوڑی دیر رو لیتی ۔ میں کھڑکیاں بند کر دیتا اور بات ختم ہو جاتی ۔ مگر اب کے معاملہ سنگین تھا ۔ میں نے اُسے خاصی سزا دی ۔"

اُس نے مجھے بتایا کہ یہی وجہ ہے کہ اسے میرے مشورے کی ضرورت پیش آئی ہے ۔ لیمپ دھواں دے رہا تھا ۔ وہ اُس کا فتیلہ ٹھیک کرنے کے لئے رُکا ۔ مگر میں سارا وقت کچھ کہے بغیر اس کی بات سنتا رہا ۔ میں تقریباً ایک بوتل شراب پی چکا تھا اور میری کنپٹیوں میں بہت حرارت محسوس ہو رہی تھی ۔ میں راموں کے سگریٹ پیتا رہا کیونکہ میرے اپنے سگریٹ ختم ہو گئے تھے ۔ کچھ آخری ٹرامیں روانہ ہو رہی تھیں ۔ ان کا شور ہمارے علاقہ سے دُور ہوتا جا رہا تھا مگر رامون نے بات جاری رکھی ۔ جو بات اسے اب پریشان کر رہی تھی ۔ وہ یہ تھی کہ اُسے اب بھی اُس عورت سے جنسی ملاپ کی خواہش تھی ، مگر وہ چاہتا تھا کہ اُسے عبرتناک سزا دے ۔

اُس نے پہلے سوچا کہ وہ اُسے ایک ہوٹل میں لے جائے اور وہاں شریف آدمیوں کو بلا کر اُن کے سامنے اُسے ذلیل و رسوا کرے ۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ پولیس کو منوا لے گا کہ اس کا نام بازاری عورتوں کے رجسٹر میں درج کر لیں ۔ فوراً ہی اُس نے محلے کے چند غنڈوں کو بلایا ۔ اپنے دوست جو عورتوں کی آمدنی پر گزر اوقات کرتے تھے لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی ۔ جیسا کہ رامون نے مجھ سے کہا اس کاروبار میں رہنا ہی عذاب

ہے۔ اُس نے یہ اُن کو بھی کہا اور پھر اُنہوں نے تجویز کیا کہ وہ اُسے کلنگ کا ٹیکا لگا دے مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اس قصے کے متعلق میری رائے دریافت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جواب دیا:

"میری کوئی خاص رائے نہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ کہانی دلچسپ ہے۔"

اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "کیا اُس لڑکی نے اُسے دھوکا نہیں دیا؟" مجھے اقرار کرنا پڑا کہ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر مجھے سزا دینا مقصود ہوتی تو میں اس کی جگہ کیا کرتا۔ میں نے اُس سے کہا کہ ان معاملوں میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا تا۔ مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ اس کو کیوں سزا دینا چاہتا ہے۔ میں نے پھر کچھ شراب پی۔ اُس نے ایک سگریٹ سلگایا اور اپنے خیالات میرے سامنے پیش کئے۔ وہ اُسے ایک خط لکھنا چاہتا تھا۔ جس میں جوتم پیزار بھی ہو اور ساتھ ساتھ ایسی باتیں بھی جن سے اُسے احساس ندامت ہو۔ پھر جب وہ لوٹے گی وہ اُس کے ساتھ سوئے گا اور ——— وہ اس کے منہ پر تھوکے گا اور اس کو کمرے سے باہر نکال پھینکے گا۔

میں نے اتفاق کیا کہ تجویز بُری نہیں۔ اس طریقے سے اُسے مناسب سزا مل جائے گی۔

لیکن رامون نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے آپ کو ایسا خط لکھنے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس لئے اُس نے میری طرف رجوع کیا ہے کہ میں اسے ایک مسودہ تیار کر دوں۔ چونکہ میں خاموش رہا اُس نے کہا، اگر میں بُرا نہ مانوں تو لگے ہاتھوں یہ کام بھی کر ہی ڈالوں۔ میں نے کہا، خوب!

پھر وہ شراب کا ایک گلاس پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے رکابیاں اور بچا ہوا کچھ کالا حلوہ سنبھالا۔ پلاسٹک کا میز پوش بڑے احتیاط سے پونچھا۔ پھر بستر کے پاس

رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی میز کی دراز سے لکیر دار کاغذ، سُرخ لکڑی کا چھوٹا سا قلمدان، ایک لفافہ اور لال روشنائی کی ایک بوتل نکالی۔ جب اُس نے مجھے عورت کا نام بتایا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ عرب خاندان کی ہے۔ میں نے خط لکھا۔ مجھے لکھتے ہوئے کچھ خطرہ کا احساس ہوا مگر میں رامون کو خوش کرنے کے لئے لکھتا گیا کیونکہ کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اُسے ناراض کرتا۔ پھر میں نے بلند آواز میں اُسے خط پڑھ کر سُنایا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے سر ہلا کر سنتا رہا۔ پھر اُس نے تقاضا کیا کہ میں دوبارہ پڑھوں۔ وہ بالکل مطمئن تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"میں خوب جانتا ہوں کہ تم جہاں دیدہ آدمی ہو۔"

میں نے پہلے غور نہ کیا کہ وہ مجھے "تم" کہہ کر پکار رہا تھا۔ صرف تب پتہ چلا جب اُس نے اعلان کیا:

"اب تو میرا سچا دوست ہے۔"

وہ یہ فقرہ دہراتا رہا اور میں نے جواب دیا ——— "ہاں!"

مجھے تو اُس کی دوستی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا مگر وہ سچ مچ اس پر ناز کر رہا تھا۔ اُس نے خط لفافے میں بند کیا اور ہم نے شراب ختم کر دی۔ پھر کچھ کہے بغیر ہم سگریٹ پیتے رہے۔ باہر بالکل خاموشی تھی۔ ہمیں گزرتی ہوئی ایک کار کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا:

"دیر ہو چکی ہے۔"

رامون کا بھی یہی خیال تھا۔ اُس نے کہا:

"وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔"

اور ایک طرح سے یہ بات ٹھیک بھی تھی۔ مجھے نیند آ رہی تھی اور اُٹھنا مصیبت معلوم ہو رہا تھا۔ میں ضرور تھکا ہوا نظر آتا ہوں گا کیونکہ رامون نے کہا کہ غم زیادہ نہیں کرنا چاہئے۔ پہلے تو میں بات نہ سمجھ سکا۔ مجھے اُس نے کہا کہ اُسے معلوم ہے کہ امی فوت ہو چکی ہے لیکن یہ تو ایک حادثہ ہے جو ہر ایک کو ایک نہ ایک دن پیش آتا ہے۔ یہی رائے میری بھی تھی۔

میں اٹھا۔ رامون نے بڑے جوش سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا:

"مرد ہمیشہ ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں۔"

اس کے یہاں سے نکلتے ہوئے میں نے دروازہ بند کیا اور دم بھر سیڑھیوں پر اندھیرے میں کھڑا رہا۔ ساری بلڈنگ خاموش تھی۔ سیڑھیوں کے پنجرہ کی گہرائی میں سے مرطوب ہوا اُوپر آ رہی تھی۔ مجھے صرف اپنے خون کی حرکت کانوں میں سائیں سائیں کرتی سنائی دے رہی تھی۔ میں ساکت کھڑا رہا۔ بڈھے سلمانو کے کمرے سے کتّے کی آہستہ آہستہ بلکنے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ ایک پھول کی طرح جو خاموش اور اندھیرے سے پھوٹتا ہے۔

۴

میں نے سارا ہفتہ دفتر میں خوب کام کیا۔ رامون ایک مرتبہ مجھ سے ملنے آیا اور اُس نے کہا کہ اُس نے خط بھیج دیا ہے۔ میں دو دفعہ ایمینوئل کے ساتھ سینما گیا۔ اس کے کچھ پلّے نہ پڑتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ سارا وقت سمجھانا پڑتا تھا۔ کل سنیچر تھا۔ ماری جیسے کہ ہم نے طے کیا تھا میرے یہاں آئی۔ اُسے دیکھتے ہی میری طبیعت اُس پہ آ گئی۔ کیونکہ وہ ایک خوبصورت سُرخ و سفید دھاریدار لباس زیبِ تن کئے ہوئے تھی اور ایک خوشنما چمڑے کی سینڈل۔ اس کی سخت چھاتیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ غسلِ شمسی سے اس کا چہرہ پھول کی طرح نکھر رہا تھا۔ ہم نے ایک بس پکڑی اور الجیرسے چند کلومیٹر باہر نکل گئے۔ سمندر کے کنارے چٹانوں کے درمیان زمین پر جہاں گھاس اُگی ہوئی تھی بیٹھ گئے۔ چار بجے دھوپ زیادہ تیز نہیں تھی۔ مگر پانی ہلکا سا گرم تھا۔ سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہریں طویل اور سُست تھیں۔ ماری نے مجھے ایک نیا کھیل سکھایا۔ لہروں کے اُوپر تیرتے ہوئے پانی پینا۔ ساری جھاگ منہ میں جمع کرنا اور پشت کے بل لیٹ کر فوراً اس کو آسمان کی طرف تھوک دینا۔ ایسے جھاگ کی ایک جھالر سی بن جاتی جو ہوا میں گم ہو جاتی یا پھر منہ پر گرم گرم بارش کی طرح آ کر پڑتی۔ مگر کچھ وقت کے بعد میرا منہ نمک کی تلخی سے جل گیا۔ پھر ماری میرے پاس

آئی اور پانی میں مجھ سے چپک گئی۔ اُس نے اپنا منہ میرے منہ پر رکھ دیا۔ اُس کی زبان نے میرے ہونٹ تازہ کیے اور ہم لمحہ بھر لہروں میں لہراتے رہے۔

جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے کپڑے بدل رہے تھے ماری مجھے چمکتی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اُس کا بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ہم نے کوئی بات نہ کی۔ میں نے اُسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ ہم جلدی میں تھے کہ بس ملے اور ہم گھر لوٹیں اور بستر میں دراز ہو جائیں۔ میں اپنی کھڑکی کھول آیا تھا اور یہ اچھا ہی رہا کیونکہ اب گرمی کی رات ہمارے سنولائے ہوئے جسموں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

صبح ماری رُک گئی اور میں نے اُس سے کہا کہ ہم اکٹھے ناشتہ کریں گے۔ وہ مان گئی۔ میں گوشت خریدنے نیچے اتر گیا۔ واپسی پر اُوپر آتے ہوئے میں نے ریموں کے کمرے میں ایک عورت کی آواز سُنی۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھے سلمانو نے اپنے کتے کو گالی بکی۔ ہم نے لکڑی کی سیڑھیوں پر پنجوں اور قدموں کی آواز سُنی اور پھر "حرامی — نمک حرام" کہتے کہتے وہ گلی میں نکل گئے۔

میں نے ماری کو بوڑھے کا قصہ سُنایا اور وہ ہنسی۔ اُس نے میرا ایک پاجامہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اپنی آستینیں چڑھا رکھی تھیں۔ جب وہ ہنسی تو پھر میری طبیعت اس پر آ گئی۔ ایک لمحہ بعد اُس نے مجھے پوچھا کہ کیا میں اُسے پیار کرتا ہوں؟ میں نے کہا:

"یہ تو ایک بے معنی سی بات ہے مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ نہیں۔"

یہ بات سن کر اُس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ مگر ناشتہ تیار کرتے ہوئے اُس کی طبیعت سنبھلی اور وہ بلا وجہ کچھ اس طرح ہنسی کہ میں نے اُس کا بوسہ لے لیا۔ میں اُس

وقت ریموں کے یہاں لڑائی جھگڑے کا شور ہوا۔

پہلے ایک عورت کی کرخت اور بلند آواز سنائی دی اور پھر ریموں کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا:

"تم نے مجھے چکمہ دیا ہے۔ تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میں تمہیں سبق سکھاؤں گا۔"

بہت شور و غل ہوا اور عورت چیختی چلاتی رہی۔ مگر کچھ اس ہولناک انداز سے کہ فوراً محلے کے سب لوگ جمع ہو گئے۔ ماری اور میں بھی باہر نکلے۔ عورت مسلسل رو رہی تھی اور ریموں اُسے متواتر پیٹ رہا تھا۔ ماری نے مجھ سے کہا کہ یہ تو بڑا ظلم ہے اور میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے کہا کہ میں پولیس کو بلواؤں۔ مگر میں نے کہا کہ مجھے سپاہی اچھے نہیں لگتے۔ بہر حال ایک پولیس والا ایک کرایہ دار کے ساتھ جو ایک نل ساز تھا اور دوسری منزل پر رہتا تھا آ ہی پہنچا۔ اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا مگر جواب نہ ملا۔ اُس نے تھوڑی دیر بعد اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ عورت رو رہی تھی اور ریموں نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے منہ میں سگریٹ لٹک رہا تھا اور انداز کچھ ایسا مسکین جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لڑکی جھٹ دروازے کے باہر لپکی اور پولیس والے کو کہا کہ ریموں نے اُس کی پٹائی کی ہے۔

"تمہارا نام؟" سپاہی نے پوچھا۔

ریموں نے جواب دیا۔

"منہ سے سگریٹ نکالو اور پھر بات کرو۔" سپاہی گرجا۔

ریموں جھجکا، میری طرف دیکھا اور سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ اب سپاہی نے پوری طاقت کے ساتھ تڑاخ سے اُس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ سگریٹ گز بھر دُور جا گرا۔ ریموں کا چہرہ اتر گیا مگر اس وقت وہ خاموش رہا۔ بعد میں بڑی عاجزانہ آواز

میں اُس نے پوچھا کہ کیا وہ سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا سکتا ہے ؟

سپاہی نے کہا کہ ہاں، مگر ساتھ ہی کہا :

"اگلی دفعہ تمہیں یاد رہے گا کہ سپاہی کوئی کٹھ پتلی نہیں ہوتا۔"

اس اثنا میں لڑکی روتی رہی اور دہراتی رہی :

"یہ مجھے پیٹتا ہے۔ یہ بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی دلالی کرتا ہے۔"

پھر ریموں نے سپاہی سے کہا :

"حولدار صاحب! کسی آدمی کو گواہوں کے سامنے دلال کہنا قانون کے مطابق ہے؟"

لیکن سپاہی نے اُسے منہ بند رکھنے کا حکم دیا۔ ریموں پھر لڑکی کی طرف مڑا اور اُس سے کہا :

"میری بنو! ذرا ٹھہرو ابھی سب ہوش ٹھکانے لگ جائے گا۔"

سپاہی نے اُس سے کہا :

"بکواس بند کرو! لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے اور تم اس وقت تک کمرے میں رہو جب تک تھانے میں کارروائی مکمل نہیں ہو جاتی۔"

اُس نے مزید کہا :

"تمہیں شرم آنی چاہیے کہ اتنے بدمست ہو گئے ہو کہ کانپنے تک نوبت آ پہنچی ہے۔"

اس وقت ریموں نے کہا :

"میں بدمست نہیں ہوں حولدار صاحب! میں آپ کے سامنے ہوں اور صرف اس وجہ سے کانپ رہا ہوں۔"

اُس نے اپنا دروازہ بند کیا اور سارے لوگ چلے گئے۔ ماری اور میں نے ناشتہ تیار کیا مگر اُسے بھوک نہ تھی۔ سارا میں ہی چٹ کر گیا۔ وہ ایک بجے چلی گئی اور میں تھوڑی دیر سو گیا۔

تین بجے کے قریب کسی نے میرے دروازے پر دستک دی اور ریموں اندر داخل ہوا اور میں نے اُس سے پوچھا کہ اس پہ کیا بیتی ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے حسب خاطر سب کام کیا لیکن افتاد یہ آن پڑی کہ عورت نے اُسے ایک طمانچہ مارا اور پھر اُس نے بھی اُسے پیٹ ڈالا۔ اس کے علاوہ جو ہوا وہ میں دیکھ ہی چکا ہوں۔ میں نے اُس سے کہا :

"میری رائے میں اب عورت کو کافی سزا مل چکی ہے لہٰذا اب معاملہ رفع دفع ہو جانا چاہیے۔"

یہی اُس کی رائے تھی۔ اُس نے کہا :

"سپاہی نے خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔ میں نے بہرحال جی بھر کے اس کی مرمت کر ہی ڈالی تھی۔"

اُس نے مزید کہا کہ وہ پولیس کو خوب پہچانتا ہے اور اُن سے نپٹنا جانتا ہے۔ اُس نے پھر مجھ سے پوچھا کہ کیا میں موجود تھا جب اُس نے سپاہی کو جوابی گھونسہ رسید کیا تھا۔ میں نے جواب دیا :

"میں وہاں نہیں تھا اور بہرحال مجھے سپاہی پسند نہیں۔"

ریموں بہت مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اُس کے ساتھ باہر سیر گشت کے لیے چلوں گا۔ میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بالوں کو کنگھی کرنا شروع کر

دی۔ ریموں نے مجھ سے کہا کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کا گواہ بنوں۔ میرے لئے یہ سب برابر تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ بیان کیا دینا چاہیئے۔ ریموں کے قول کے مطابق یہ بیان دینا کافی تھا کہ لڑکی نے اُسے دھوکا دیا ہے۔ میں نے اس کا گواہ بننا قبول کر لیا۔

ہم باہر نکلے اور ریموں نے ایک قہوہ خانہ میں مجھے برانڈی پیش کی۔ پھر ہم نے بلیرڈ کی ایک بازی کھیلی۔ مگر مجھے مشق نہیں تھی اور میں ہار گیا۔ پھر وہ ایک چکلے کو جانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے یہ پسند نہیں۔ ہم آہستہ آہستہ لوٹے اور اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ کس قدر خوش ہے کہ وہ اپنی داشتہ کو سزا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ وہ بہت پیار محبت کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ وقت اجازت لینے کے لئے مناسب ہے۔

دُور سے میں نے بوڑھے سلمانو کو بندرگاہ کی سیڑھیوں پر دیکھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو میں نے غور کیا کہ کُتا اس کے ہمراہ نہیں تھا وہ ہر طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ گلی کے گھُپ اندھیرے کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا وہ بڑبڑا رہا تھا اور اُس کے الفاظ میں کوئی ربط نہ تھا۔ اُس نے سڑک پر اپنی چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھوں سے پھر تلاش شروع کر دی۔ جب ریموں نے اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مبہم طور پر سُنا کہ وہ بڑبڑا رہا ہے۔

"حرامی —— سورا"

اور اس کی گھبراہٹ بدستور جاری رہی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کا کُتا کہاں ہے؛ اُس نے جلدی میں جواب دیا؛

"وہ بھاگ گیا ہے۔" پھر دفعتاً اُس نے بلند آواز سے کہا "میں حسبِ معمول اُسے

کھیتوں کی طرف ٹہلانے لے جا رہا تھا۔ میلہ میں سامان کی ریڑھیوں کے ارد گرد بہت لوگ جمع تھے۔ میں دم بھر کے لئے ایک دکان دیکھنے کے لئے رُکا اور جب میں نکلا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ بہت عرصہ سے میں سوچ رہا تھا کہ اسے ایک پٹہ خرید دوں جو ذرا کم کھُلا ہو مگر مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ نمک حرام اس طرح چلا جائے گا۔"

پھر ریموں نے اُسے سمجھایا کہ کُتے گم ہو ہی جاتے ہیں اور پھر لوٹ آتے ہیں۔ اُس نے اُسے ایسے کتّوں کی مثالیں دیں جو اپنے مالک کو ڈھونڈنے کی خاطر میلوں مسافت طے کر کے آتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود بوڑھا پریشان معلوم ہوتا تھا۔

"وہ اسے جان سے مار ڈالیں گے تم سمجھے؟ میرا مطلب ہے پولیس والے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اُسے گھر لے جائے گا اور اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ اس کے زخموں کے کھرنڈ سے سب لوگوں کو گھن آتی ہے۔ سپاہی اس کو مار ڈالیں گے۔ یہ یقینی بات ہے۔"

پھر میں نے اُس سے کہا:

"اُسے تھانے میں جانا چاہیئے۔ وہاں ایک کانجی ہاؤس ہے جہاں آوارہ کتوں کو رکھا جاتا ہے۔ وہاں واجب الادا رقم جمع کرنی چاہیئے اور کُتا واپس مل جائے گا۔"

اُس نے مجھ سے پوچھا:

"رقم کتنی ادا کرنا پڑتی ہے؟"

مجھے معلوم نہ تھا۔ اُسے پھر غصّہ آ گیا:

"ایسے نمک حرام کے لئے مال خرچ کرنا، اسے موت ہی آ جائے تو اچھا ہے۔"

اور اُس نے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ ریموں ہنسا اور عمارت میں گھس گیا۔ میں اُس

کے پیچھے ہو لیا اور ہم دونوں اپنے مکان کی منزل کو چلے گئے۔ ایک لمحہ بعد میں نے بوڑھے سلمانو کے قدموں کی آہٹ سُنی۔ اُس نے میرے دروازے پر دستک دی۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو لمحہ بھر وہ چوکھٹ پر رُکا اور پھر مجھ سے کہا:

"معاف کیجئے ——— معاف کیجئے!"

میں نے اُسے اندر آنے کی دعوت دی مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ داخل ہو۔ وہ اپنے جُوتوں کی نوک اور اپنے کانپتے ہوئے کھُرنڈ والے ہاتھ دیکھتا رہا۔ میری طرف دیکھے بغیر اُس نے مجھ سے کہا:

"موسیو مرسو! وہ سچ مچ مجھے اُس سے جُدا تو نہیں کر دیں گے! وہ ضرور واپس لائیں گے ورنہ میں اس کے بغیر کہاں جاؤں گا؟"

میں نے اُس سے کہا کہ تھانے والے گم شدہ کتّوں کو تین دن حفاظت میں رکھتے ہیں اور اس مدت میں مالک اُنہیں واپس لے جا سکتے ہیں اور اب اُسے اختیار ہے، جو مناسب سمجھے کرے۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا "شب بخیر!" اُس نے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ مجھے سنائی دیا کہ وہ کمرے میں بے چینی سے اِدھر اُدھر چل رہا ہے۔ اس کا پلنگ تڑخ رہا ہے اور ایک عجیب ہلکی سی آواز اُس کے تنگ کمرہ سے آ رہی ہے۔ میں نے سمجھا کہ وہ رو رہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اماں کا خیال آ گیا۔ اگلی صبح مجھے جلدی اٹھنا تھا۔ مجھے بھوک نہ تھی اور میں کھانا کھائے بغیر سو گیا۔

۵

ریموں نے مجھے دفتر ٹیلیفون کیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اس کے ایک دوست نے (جس سے اُس نے میرا تذکرہ کیا تھا) مجھے دعوت دی ہے کہ اتوار کا دن الجیرکے باہر اس کے بنگلہ میں گزاریں جو سمندر کے کنارے پر ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں ایسا کرنا تو چاہوں گا مگر میں پہلے ہی ایک لڑکی کے ساتھ دن گزارنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ ریموں نے فوراً کہا کہ وہ اسے بھی دعوت دیتا ہے۔ اس کے دوست کی بیوی بہت خوش ہوگی کہ وہ مردوں کے انبوہ میں اکیلی عورت نہیں ہے۔

میں چاہتا تھا کہ فوراً ٹیلیفون بند کر دوں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہمارا افسر پسند نہیں کرتا کہ ہم شہر میں ذاتی ٹیلیفون کیا کریں۔ مگر ریموں نے تقاضا کیا کہ ذرا تھم جاؤں اور کہا کہ وہ شام کو مجھے دعوت نامے پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اب وہ چاہتا تھا کہ اپنے متعلق مجھ سے بات چیت کرے۔

"معاملہ یوں ہے،" اُس نے کہا "عربوں کی ایک ٹولی سارا دن میرا پیچھا کرتی رہی ہے۔"

اس کے قول کے مطابق وہ اُس کی پُرانی داشتہ کے بھائی کی تلاش میں تھے۔

"اگر شام کو لوٹتے ہوئے تم انہیں عمارت کے قریب دیکھو تو مجھے اطلاع دینا۔"۔ میں نے کہا "یہ طے ہے"۔

تھوڑی دیر بعد افسر نے مجھے بلوایا۔ اس وقت مجھے اُلجھن سی ہوئی کیونکہ میں نے سوچا کہ وہ مجھ سے کہنے والا ہے کہ ٹیلیفون کم کیا کرو اور کام زیادہ۔ مگر یوں نہ تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ ایک سکیم کے متعلق جو ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے مجھ سے بات چیت کرنے والا ہے اور اس معاملہ میں وہ صرف میری رائے دریافت کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ دفتر کی ایک شاخ پیرس میں کھولے جو وہاں کا کام وہیں نپٹا لیا کرے اور براہ راست بڑی فرموں کے ساتھ رابطہ قائم کرے۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا مجھے وہاں جانے میں دلچسپی ہے۔ اس طرح مجھے پیرس میں رہنے کا موقع مل جائے گا اور سال کے ایک حصے میں سفر بھی کر سکوں گا۔

"تم جوان ہو اور مجھے یقین ہے کہ یہ زندگی تمہیں پسند آئے گی۔"

میں نے کہا کہ ہاں مگر در حقیقت مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اُس نے پھر مجھ سے پوچھا کہ کیا میں زندگی میں کوئی تغیّر نہیں پسند کرتا؟ میں نے جواب دیا کہ انسان دراصل کبھی زندگی نہیں بدلتا —— بہر حال ہر چیز کا اپنا اپنا مقام ہے اور مجھے اپنی زندگی کچھ ایسی ناپسند بھی نہیں۔ وہ خوش معلوم نہیں ہوتا تھا۔ مجھ سے کہا کہ میں ہر وقت گھما پھرا کر بات کرتا ہوں اور مجھ میں کوئی امنگ نہیں اور کاروبار کے لیے یہ رویہ تباہ کن ہے۔ میں پھر کام پر واپس چلا گیا۔ بہتر ہوتا کہ میں اسے ناراض نہ کرتا۔ لیکن مجھے اپنی زندگی بدلنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اس پر بہت غور کیا۔ میں مطمئن تھا جب میں طالب علم تھا مجھے اس قسم کی بہت خواہشات تھیں۔ مگر جب میں نے پڑھائی

چھوڑی تو میں نے بہت جلد پا لیا کہ دراصل یہ سب غیر اہم اور بے کار باتیں ہیں۔

شام کو ماری میری تلاش میں آئی اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟ میں نے کہا کہ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر وہ چاہتی ہے تو ہم یوں بھی کر سکتے ہیں۔ پھر وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ مجھے اُس سے عشق ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جیسا کہ میں ایک مرتبہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں یہ بات بے معنی ہے اور بے شک مجھے اُس سے محبت نہیں ہے۔

"پھر کیوں مجھ سے شادی کرتے ہو؟" اُس نے کہا۔

میں نے اُسے سمجھایا کہ اس کی تو ہرگز کوئی اہمیت نہیں اور اگر اس کی یہ خواہش ہے تو ہم شادی کر سکتے ہیں۔ بہر حال تقاضا تو وہ کر رہی تھی اور میں نے صرف ہاں کر دی۔ اس نے پھر کہا:

"شادی نہایت سنجیدہ معاملہ ہے۔"

میں نے جواب دیا —"نہیں!"

وہ ایک لمحہ کے لیے ساکت ہو گئی اور خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے بات کی۔ وہ مجھ سے محض یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر بالفرض کوئی اور عورت ایسی ہی تجویز پیش کرے تو کیا میں اسے قبول کروں گا اور کیا میں اس کو بھی اسی طرح پیار کروں گا۔ میں نے کہا "طبعاً"۔ اُس نے پھر کہا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور مجھے اس کا بالکل احساس اور علم نہیں ہے۔ خاموشی کے ایک اور لمحہ بعد وہ بڑبڑائی کہ میں عجیب بیہودہ آدمی ہوں مگر بے شک یہی وجہ تھی کہ اسے مجھ سے محبت ہے لیکن شاید اسی وجہ سے ایک دن اُسے مجھ سے نفرت ہو جائے گی۔ چونکہ میں خاموش رہا اور کچھ نہ کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی مجھ سے

ہم آغوش ہو گئی اور اعلان کیا کہ وہ واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ وہ جو چاہتی ہے ہم کر سکتے ہیں۔ میں نے پھر اُس سے افسر کی تجویز کا تذکرہ کیا۔ ماری نے مجھ سے کہا کہ وہ پیرس دیکھنا چاہے گی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں وہاں کچھ عرصہ رہ چکا ہوں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کیسا شہر ہے۔ میں نے کہا کہ گندہ ہے وہاں کبوتر اور چوراہے کالے اور آدمی کچھ سفید ہیں۔

پھر ہم ٹہلنے کے لئے چل دیئے اور بڑے بازاروں سے ہوتے ہوئے شہر کے اس پار نکل گئے۔ عورتیں خوبصورت تھیں اور میں نے ماری سے پوچھا کہ اُس نے بھی دھیان دیا ہے کہ نہیں۔ اُس نے کہا ہاں وہ مجھے خوب سمجھتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے بہت باتیں کیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہے اور میں نے اُس سے کہا کہ ہم اکٹھے سیلسط کے یہاں کھانا کھا سکتے ہیں۔ یہ بات اُسے پسند آئی مگر وہ شام کو مصروف تھی۔ اپنے گھر کے قریب پہنچنے پر میں نے اُسے خدا حافظ کہا۔ وہ میری طرف تکنے لگی:

"تم نہیں جاننا چاہتے کہ میں رات کو کیا کر رہی ہوں؟"

میں جاننا تو ضرور چاہتا تھا مگر میں نے اُس کی بات پر دھیان نہ دیا کیونکہ اُس کا انداز مجھے ملامت کرنے کا تھا۔ وہ میری بوکھلاہٹ پر ہنسی۔ وہ میری طرف جھکی اور مجھے بوسہ دیا۔

میں نے اکیلے سیلسط کے یہاں کھانا کھایا۔ میں نے کھانا شروع کیا ہی تھا کہ ایک عجیب پست قد عورت داخل ہوئی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ میرے میز پر بیٹھ سکتی ہے ظاہر ہے کہ وہ یہ کر سکتی تھی۔ اس کی حرکتیں بے جوڑ اور بے ربط تھیں اور اس کے سبب

سے سنھی چہرے پر چمکدار آنکھیں تھیں۔ اُس نے اپنا کسا ہوا کوٹ اتارا اور بیٹھ گئی۔ وہ طعام نامہ بے صبری سے دیکھنے لگی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں میں عجیب سی بے قراری تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بجلی کے تار پر بیٹھی ہے۔ اُس نے سیلسط کو بلایا اور ایک ہی سانس میں اندھا دھند بڑی باضابطہ آواز میں فوراً سارا کھانا آرڈر کر دیا۔ کھانے کے انتظار کے دوران اُس نے اپنا بٹوا کھولا۔ اُس نے ایک پنسل اور کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا نکالا اور کھانا آنے سے پہلے ہی بل کا حساب کرنے لگی۔ پھر اُس نے واسکٹ کی جیب سے پوری رقم نکالی اور ریزگاری جو بخشش دینی تھی اپنے سامنے رکھ لی۔ عین اس وقت کھانے کی پہلی پلیٹ آئی جو وہ پوری رفتار سے نگل گئی۔ دوسری پلیٹ کا انتظار کرتے ہوئے اُس نے پھر اپنے بٹوے سے ایک نیلی پنسل اور ایک رسالہ نکالا جس میں آئندہ ہفتہ بھر کے ریڈیو کے پروگرام تھے۔ بڑی احتیاط سے اُس نے ایک ایک کر کے تقریباً سبھی پروگراموں پر نشان لگا دیئے۔ رسالہ کے درجن بھر صفحے تھے۔ اُس نے کھانے کے دوران اُن کا مطالعہ جاری رکھا۔ میں کھانا ختم کر چکا تھا اور وہ بدستور محنت سے رسالہ پر نشان لگا رہی تھی۔ پھر وہ اٹھی۔ اپنا کوٹ مشین کی طرح قاعدے اور ضابطے کے ساتھ پہنا اور تیزی سے باہر چلی گئی۔ چونکہ مجھے کچھ کام نہ تھا میں بھی تھوڑی دور اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ سڑک کے کنارے پٹڑی پر چلنے لگی۔ نہایت تیزی اور خود اعتمادی کے ساتھ وہ ادھر اُدھر مڑے بغیر تیر کی طرح سیدھی اپنے راستے پر جا رہی تھی۔ آخر کار وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں نے گھر کی راہ لی۔ میں نے سوچا کہ "وہ مشین" بھی ایک عجیب شے تھی مگر جلد ہی میں اسے بھول گیا۔

گھر کے دروازے کے سامنے مجھے بوڑھا سلمانو ملا۔ میں نے اُسے اندر آنے

کو کہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا کتا گم ہو گیا ہے کیونکہ وہ کانجی ہاؤس میں نہیں ہے۔ وہاں کے کارندوں نے اُس سے کہا تھا کہ شاید وہ کسی موٹر تلے آ گیا ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تھانے سے معلوم کیا جائے۔ میں نے جواب دیا کہ کوئی ان چیزوں کا وہاں حساب تو رکھتا نہیں کیونکہ ہر روز ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ بہتے ہیں۔ میں نے بڈھے سلمانو سے کہا کہ وہ ایک اور کتا کیوں نہیں پال لیتا۔ مگر اُس نے ٹھیک کہا کہ وہ اس سے مانوس ہو چکا تھا۔

میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور سلمانو میز کے سامنے ایک کرسی پر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے۔ وہ اپنی پُرانی ٹوپی پہنے رہا۔ وہ اپنی پیلی مونچھوں تلے جملوں کے آخری حصّے چبا رہا تھا۔ وہ مجھے بور تو کر رہا تھا مگر مجھے کچھ کام نہیں تھا اور نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ کچھ کہنے کی خاطر میں نے اُس کے کتّے کا ذکر چھیڑا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اپنی بیوی کی موت کے بعد اُس نے کتا پالا تھا۔ اُس نے خاصی دیر سے شادی کی تھی۔ جوانی میں اُسے تھیٹر کا شوق تھا۔ اپنی رجمنٹ کے تھیٹر میں اچھا خاصا پارٹ ادا کیا کرتا تھا۔ مگر بعد میں اُس نے ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی اور اس پر اسے کچھ افسوس نہیں تھا کیونکہ اب اس کے پاس سر چھپانے کو ایک چھوٹا سا ٹھکانہ تھا وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش نہیں تھا لیکن مجموعی طور پر وہ اس سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ جب وہ مر گئی تو اُسے تنہائی کا بہت احساس ہوا۔ پھر اُس نے اپنے ایک ساتھی سے جس کی کتیا نے پلّے دیئے تھے ایک بچہ مانگا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا اور اُسے بوتل سے دُودھ پلانا پڑتا تھا۔ چونکہ کتّے کی عمر انسان سے کم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ دونوں ایک ہی ساتھ بڑھاپے کو پہنچے۔

"وہ بڑا بد اخلاق تھا۔" سلمانو نے کہا، "وقتاً فوقتاً ہماری لڑائی بھی ہوتی تھی مگر تھا وہ بہر حال ایک اچھا کتا۔"

میں نے کہا:

"وہ اچھی نسل کا تھا۔"

اور سلمانو بہت خوش نظر آیا اور پھر اُس نے مزید کہا:

"تم اس کو بیماری سے پہلے پہچان بھی نہ سکتے۔ اس کے بال بہت خوبصورت تھے۔ جلد کی بیماری کے بعد سلمانو ہر روز صبح شام اُسے مرہم لگایا کرتا تھا لیکن اس کے قول کے مطابق اس کا اصلی مرض تو بڑھاپا تھا اور بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں۔

اس وقت میں نے جمائی لی اور بوڑھے نے اعلان کیا کہ وہ رخصت ہوا چاہتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ ٹھہر سکتا ہے اور یہ بھی کہا کہ میں کتّے کے حادثہ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ امّی کو اُس کا کتا بہت پسند تھا۔ امّی کی بات کرتے ہوئے وہ اُن کو "آپ کی بے چاری والدہ" کہتا تھا اُس نے فرض کر لیا تھا کہ امّی کی موت کے بعد مجھے بہت غمگین ہونا چاہیے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا بہت بوکھلاہٹ اور غصّے کے انداز میں کہ اُسے معلوم ہے کہ محلے کے لوگ مجھے سمجھنے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ میں نے امّی کو بوڑھوں کے خیراتی ہسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔ لیکن وہ بے شک مجھے پہچانتا ہے اور خوب سمجھتا ہے کہ مجھے امّی سے بہت پیار تھا۔

میں نے اُسے جواب دیا:

"مجھے تو ابھی تک معلوم نہ تھا کہ اس معاملہ میں لوگ مجھے بُرا سمجھتے ہیں۔ لیکن

بوڑھوں کا ہسپتال مجھے ایک فطری تقاضا معلوم ہوتا تھا کیونکہ میرے پاس اُمی کی دیکھ بھال کے لئے کافی سرمایہ نہ تھا۔" بہر حال میں نے کہا "انہوں نے بہت عرصے سے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور اندر ہی اندر اکیلی جلتی رہیں۔"

"ہاں!" اُس نے کہا "بوڑھوں کے ہسپتال میں کم از کم ساتھی تو مل جاتے ہیں۔"

پھر اُس نے اجازت چاہی۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ اُس کی زندگی بدل چکی تھی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کرے۔ جب سے میں اُسے جانتا ہوں پہلی مرتبہ اُس نے کسی حیلے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور مجھے اس کی جلد کے کھرنڈ محسوس ہوئے۔ وہ ذرا مسکرایا اور جانے سے پہلے کہا:

"مجھے امید ہے کہ کتے آج کی رات نہیں بھونکیں گے۔ میں ہمیشہ یہ سوچنے لگتا ہوں کہ یہ میرا ہی کتا ہے۔"

٦

اس اتوار کی صبح کو میں بڑی مشکل سے جاگا۔ ماری کو کندھے ہلا کر مجھے جگانا پڑا۔ ہم نے کچھ ناشتہ نہ کیا کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ سویرے سویرے سمندر میں نہانے چلے جائیں۔ میں بالکل خالی الذہن تھا اور میرے سر میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ صبح کے پہلے سگریٹ کا مزا تلخ تھا۔ ماری میرا مذاق اڑا رہی تھی کیونکہ اُس نے کہا کہ میں جنازہ میں شامل ہونے والوں کی طرح سوگوار نظر آرہا ہوں۔ میرا حال واقعی پتلا تھا۔ اُس نے سفید تولیہ کا ایک ڈھیلا ڈھالا جامہ زیب تن کیا اور اپنے بال کھلے چھوڑ دیے۔ میں نے اُس سے کہا کہ وہ خوبصورت لگ رہی ہے۔ یہ سن کر وہ خوشی کے مارے خوب ہنسی۔

نیچے اُترتے ہوئے ہم نے ریمون کے دروازے پر دستک دی۔ اُس نے ہمیں جواب دیا کہ وہ پل بھر میں نیچے آ ہی رہا ہے۔ دن خاصا چڑھ چکا تھا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اور شاید اس لئے بھی کہ ہم نے دن بھر کھڑکی نہیں کھولی تھی۔ سڑک پر آتے ہی سورج کی روشنی مجھے طمانچے کی طرح لگی۔ مگر ماری خوشی کے مارے چہک رہی تھی اور مسلسل کہہ رہی تھی:

"موسم نہایت خوشگوار ہے۔"

میری طبیعت کچھ سنبھلی تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں نے ماری کو بتایا تو اُس نے مجھے اپنا کینوس کا تھیلا دکھا دیا جس میں ہمارے تیرنے کے دو لباس اور ایک دھاریدار تولیہ پڑا ہوا تھا۔ اب انتظار کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ ہم نے ریمول کو اپنا دروازہ بند کرتے ہوئے سُنا۔ وہ نیلی پتلون اور چھوٹی آستین والی سفید قمیص پہنے ہوئے تھا لیکن سر پر تنکوں کی ایک کشتی نما ٹوپی تھی جسے دیکھ کر ماری کو ہنسی آگئی۔ اُس کے بازو اپنے کالے بالوں تلے بہت سفید معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے اس کا لباس ذرا نہ بھایا۔ وہ نیچے اترتے ہوئے سیٹی بجا رہا تھا اور بہت مطمئن نظر آتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"سلام بڑے میاں!"

اور ماری کو اُس نے مس صاحب کہہ کر خطاب کیا۔

کل شام ہم تھانے گئے تھے۔ میں نے شہادت دی تھی کہ لڑکی نے ریمول کو دھوکا دیا تھا۔ اور پولیس نے اسے صرف زبانی تنبیہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔ میرے بیان کی کوئی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہم اس معاملہ پر ریمول سے باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ بس پکڑیں۔ سمندر اگرچہ زیادہ دور نہیں تھا مگر ہم نے سوچا کہ یوں ہم ذرا جلدی پہنچ جائیں گے۔ ریمول کا خیال تھا کہ اس کا دوست یہ دیکھ کر کہ ہم وقت سے پہلے پہنچے ہیں بہت خوش ہوگا۔ ہم چلنے ہی والے تھے کہ معاً ریمول نے مجھے اشارہ کیا کہ اپنے مقابل نگاہ ڈالوں۔

میں نے عربوں کی ایک ٹولی دیکھی۔ وہ تمباکو کی دکان کے سامنے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ وہ ہمیں خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا

کہ وہ ہمیں پتھر یا بے جان درخت سمجھتے ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ ریمول نے مجھ سے کہا کہ بائیں جانب سے دوسرا شخص اس کا قدیمی دشمن ہے۔ وہ کھویا کھویا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ بہرحال اب ان کا جھگڑا ختم ہو چکا ہے۔ ماری کو کچھ ٹھیک سمجھ نہ آئی اور اُس نے ہم سے پوچھا:

"معاملہ کیا ہے؟"

میں نے اُسے بتایا:

"وہ عرب ریمول کی تاک میں ہیں۔"

اُس نے اصرار کیا کہ ہم فوراً وہاں سے چل دیں۔ ریمول نے طنزاً اُسے ٹوکا، مگر ل نے ہنستے ہوئے کہا:

"ضروری ہے کہ ہم چل دیں۔ وہاں رُکنے کا کوئی مطلب نہیں۔"

ہم بس اشٹاپ کی طرف جو تھوڑے سے فاصلہ پر تھا چل دیئے اور ریمول نے مجھے بتایا کہ اب عرب ہمارا تعاقب نہیں کر رہے۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا وہ ابھی تک وہیں تھے اور اسی لاپرواہی سے اس جگہ کی طرف دیکھ رہے تھے جو ہم چھوڑ کر آئے تھے۔ ہم بس پر سوار ہو گئے۔ ریمول بہت مطمئن نظر آتا تھا۔ وہ ماری سے تمام وقت مذاق کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کو بھلی لگتی ہے۔ مگر اُس نے جواب میں ریمول کو تقریباً کچھ نہ کہا۔ صرف وقتاً فوقتاً مجھے مسکرا کر دیکھ لیتی۔

ہم الجیر کے نواح میں اُترے۔ ساحل بس اشٹاپ سے دُور نہ تھا۔ مگر ایک چھوٹے سے میدان مرتفع سے جو سمندر کے منظر پر چھایا ہوا تھا گزرنا پڑتا تھا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا اور اس کے تلے سطح مرتفع پیلے پتھروں اور سفید پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس

کی ڈھلوان سمندر کے کنارے کی طرف تھی ۔ ماری اپنے دھاریدار تولیہ کے تھیلے سے پھولوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور ان کی پتیوں کو گرا گرا کر خوش ہو رہی تھی ۔ ہم چھوٹے چھوٹے بنگلوں کی دورویہ قطار کے درمیان چل رہے تھے ۔ ان کے باڑ ہرے اور سفید رنگ کے تھے ۔ ان میں سے کچھ اپنے برآمدوں کے ساتھ تمارک کے درخت کے نیچے دھنسے ہوئے تھے اور کچھ پتھروں کے درمیان معلق تھے ۔

میدان مرتفع پر پہنچنے سے پہلے ساکت سمندر صاف دکھائی دیتا تھا اور ذرا دُور ایک خوابیدہ سی بڑی چٹان شفاف پانی میں کھڑی نظر آتی تھی ۔ اس پُرسکون فضا میں ہمیں موٹر کا ایک ہلکا سا شور سنائی دیا اور ہم نے بہت دُور ایک ماہی گیر کشتی دیکھی ، جو چمکتے ہوئے سمندر میں آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہی تھی ۔ ماری نے چٹان کے پتھروں سے قوس قزح بنائی ۔ ہم نے دیکھا کہ نہانے والے اس ڈھلوان پر جو سمندر کی طرف تھی ، پہلے سے ہی موجود ہیں ۔

ریموں کا دوست ساحل کے اس کنارے پر لکڑی کے ایک بنگلہ میں رہتا تھا ۔ عقب پر یہ مکان چٹان کی ٹیک لے رہا تھا اور سامنے لکڑی کے ستونوں کے سہارے کھڑا تھا ۔ یہاں سمندر کا پانی پہنچ چکا تھا ۔ ریموں نے ہمارا تعارف کروایا ۔ اس کے دوست کا نام میسن (MASSON) تھا ۔ وہ شاندار قسم کا آدمی تھا ۔ بلند قامت ، بھرا ہوا جسم اور کندھے چوڑے چکلے ۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی خوش اخلاق خاتون تھی جس کا لب و لہجہ پیرس کے لوگوں کی طرح تھا ۔ اُس نے ایک دم ہمیں خوش آمدید کہا اور بتایا کہ کھانے کو تلی ہوئی مچھلی جو اس صبح ہی پکڑی گئی تھی تیار ہے ۔ میں نے اُسے کہا کہ اس کا گھر بہت خوبصورت ہے ۔ میسن (MASSON) نے مجھے بتایا کہ وہ ہفتہ اتوار اور باقی سب چھٹیاں

وہیں گزارتے ہیں ۔ اُس نے مزید کہا کہ میرا بیوی کے ساتھ یہاں وقت خوب گزرتا ہے ۔ اس کی بیوی ماری کے ساتھ ہنستی رہی ۔ میں نے شاید پہلی مرتبہ صحیح صحیح خیال کیا کہ میں اس سے شادی کرنے والا ہوں ۔

میسن فوراً سمندر میں نہانا چاہتا تھا مگر اس کی بیوی اور ریموں ابھی نہیں جانا چاہتے تھے ۔ چنانچہ ہم تینوں نیچے اترے اور ماری فوراً پانی میں کود پڑی ۔ میسن اور میں نے ذرا انتظار کیا ۔ وہ آہستہ آہستہ بات کرتا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ اُسے ہر فقرہ کو اس جملہ پر ختم کرنے کی عادت تھی "اور میں یہ بھی کہوں گا" مگر وہ اور کوئی بات نہ کرتا جس سے فقرے کے معنوں میں کوئی اضافہ ہو ۔ ماری کے متعلق اُس نے مجھ سے کہا :

"وہ دلچسپ ہے اور میں یہ بھی کہوں گا کہ وہ خوبصورت ہے ۔"

پھر میں نے اس کے تکیہ کلام کی طرف کچھ توجہ نہ دی کیونکہ میں دھوپ سینکنے میں مصروف تھا اور اس میں مجھے لطف آ رہا تھا ۔ پاؤں تلے ریت گرم ہونا شروع ہو گئی ۔ میں نے پھر پانی میں گھسنے کی خواہش کو دبایا ۔ مگر آخر کار میں نے میسن سے کہا :

"چلو گے ؟"

میں پانی میں کود پڑا ۔ وہ آہستہ آہستہ پانی میں داخل ہوا اور جب گہرائی میں اس کے پاؤں پھسل گئے تو وہ بھی تیرنے لگا ۔ وہ بازوؤں سے تیرتا تھا اور خاصا آہستہ ۔ میں نے اسے پیچھے چھوڑ دیا اور میں ماری کے پاس پہنچ گیا ۔ ہم دونوں کا خیال تھا کہ ہم ایک ساتھ خوب تیر رہے ہیں اور بڑے مزے میں ہیں ۔

آخر کار ہم پیراکی کے تختے پر چڑھ گئے ۔ ہم کمر کے بل لیٹے ہوئے تھے ۔ میرا منہ آسمان کی طرف تھا ۔ پانی کی آخری بوندیں جو میرے منہ میں ٹپک رہی تھیں ، دھوپ میں

سوکھنے لگیں۔ ہم نے دیکھا کہ میسن بھی دھوپ سینکنے کے لئے سمندر کے کنارے لوٹ آیا ہے۔ دُور سے وہ وہیل مچھلی کی طرح بہت بھاری بھرکم معلوم ہوتا تھا۔ ماری چاہتی تھی کہ ہم اکٹھے تیریں۔ میں اس کے پیچھے ہولیا۔ میں نے اس کی کمر پکڑ رکھی تھی اور وہ بازؤں کے بل تیر رہی تھی اور میں اُس کو پاؤں ہلانے میں مدد دے رہا تھا۔ صبح دم پانی کا ہلکا ہلکا شور ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تھک گیا ہوں۔ پھر میں نے ماری کو چھوڑ دیا اور سیدھا تیرتا ہوا لوٹ آیا۔ اب میرا سانس ٹھیک آ رہا تھا۔ میسن کے پاس کنارے پر میں اُلٹا پیٹ کے بل لیٹ گیا اور منہ ریت پر رکھ دیا۔ میں نے اُس سے کہا:

"اس میں بڑا مزہ ہے۔"

اُس کی بھی یہی رائے تھی۔ کچھ دیر بعد ماری لوٹ آئی۔ میں مڑا تاکہ اُسے قریب آتا ہوا دیکھوں۔ وہ نمکین پانی سے اٹی ہوئی تھی اور اُس نے اپنے بال پیچھے کئے ہوئے تھے۔ وہ میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ سُورج اور اس کے جسم کی ملی جلی گرمی سے مجھ پر ہلکی سی غنودگی طاری ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ماری نے میرا شانہ ہلایا اور کہا کہ میسن اپنے یہاں چلا گیا ہے۔ شاید کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی۔ لیکن ماری نے مجھ سے کہا کہ صبح سے میں نے ایک بار بھی اُس کو بوسہ نہیں دیا یہ بات ٹھیک تھی۔ اگرچہ میرا جی کئی بار چاہا۔

"پانی میں آؤ!" میں نے اُس سے کہا۔

ہم بھاگے تاکہ چھوٹی لہروں میں لیٹ سکیں۔ ہم نے کچھ ہاتھ پیر مارے اور

وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ اس کی ٹانگیں میری ٹانگوں کے گرد تھیں اور مجھے اس پر پیار آگیا۔ ہم لوٹے تو میسن اپنے بنگلے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہمیں پہلے ہی آواز دے رہا تھا۔ میں نے کہا:

"مجھے شدت کی بھوک لگی ہوئی ہے۔"

اس نے فوراً اپنی بیوی کو کہا کہ میں اُسے بہت اچھا لگتا ہوں۔ کھانا لذیذ تھا۔ میں اپنے حصّہ کی مچھلی نگل گیا۔ گوشت اور تلے ہوئے آلو ابھی باقی تھے۔ ہم سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ میسن بیشتر شراب پیتا رہا اور مجھے بھی مسلسل دیتا رہا۔ جب کافی کی نوبت آئی تو میرا سر ذرا بھاری سا ہو رہا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے سگریٹ پینا شروع کر دیئے ۔ میسن، ریموں اور میں — ہم نے فیصلہ کیا کہ اگست کا مہینہ سمندر کے کنارے ایک ساتھ گزاریں گے۔ ماری نے ہمیں اچانک کہا:

"تمہیں معلوم ہے کیا وقت ہو گیا ہے۔ صرف ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔"

ہم سب حیران ہوئے لیکن میسن نے کہا:

"کھانا ذرا جلدی ہو گیا ہے اور دراصل کھانے کا کوئی وقت تو متعین نہیں جب بھوک لگے، کھانے کا وقت ہے۔"

مجھے معلوم نہیں کہ اس پر ماری کو کیوں ہنسی آگئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ شراب فرا زیادہ پی گئی تھی — میسن نے پھر مجھ سے پوچھا:

"کیا تم سمندر کے کنارے میرے ساتھ ٹہلنے چلو گے۔ میری بیوی کھانے کے بعد ہمیشہ قیلولہ کرتی ہے۔ مگر مجھے یہ پسند نہیں۔ مجھے ذرا پیدل سیر کرنا چاہیے۔ میں ہمیشہ اُس سے کہتا ہوں کہ صحت کے لئے یہ بہت بہتر ہے مگر آخر اسے اپنی رائے رکھنے کا اختیار

ہے:"

ماری نے اعلان کیا کہ وہ مادام میسن کے ساتھ رہے گی تاکہ برتن دھونے میں اُس کی مدد کر سکے۔ ننھی سی پیرس کی خاتون نے کہا:

"ضروری ہے مردوں کو باہر نکالا جائے۔"

چنانچہ ہم تینوں نیچے اُترے۔ سُورج سر پر آپہنچا تھا۔ دھوپ ریت پر پڑ رہی تھی۔ ساحل پر اب کوئی آدمی نہیں تھا۔ سمندر کے کنارے چھری کانٹوں اور برتنوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ چٹانوں سے دھوپ کی وجہ سے بخارات نکل رہی تھی اور سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ شروع شروع میں ریموں اور میسن ایسی چیزوں اور ایسے لوگوں کے متعلق باتیں کرتے رہے جن سے میں ناواقف تھا۔ مجھے سمجھ آئی کہ وہ ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں اور زندگی کا ایک حصّہ اکٹھے گزار چکے ہیں۔ ہم پانی کی طرف جا رہے تھے اور سمندر کے کنارے چل رہے تھے۔ کبھی کبھار ایک چھوٹی سی لہر جو دوسری سے ذرا طویل تر ہوتی ہمارے کینوس کے جوتے تر کر جاتی۔ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ میرے ننگے سر پر جو دھوپ پڑ رہی تھی۔ اس کی وجہ سے میں تقریباً سویا ہوا تھا۔ عین اس وقت ریموں نے میسن سے کچھ کہا جو میں ٹھیک طور پر سن نہ سکا۔ بہر حال میں تا سمجھ گیا کہ ساحل کا آخری حصّہ ابھی بہت دُور ہے۔ دو عرب جیسے نیلے تنور میں پکے ہوں ہماری طرف آرہے تھے۔ میں نے ریموں کی طرف دیکھا اور اُس نے کہا:

"کیا یہ وہی ہیں؟"

ہم چلتے گئے۔ میسن نے پوچھا کہ وہ کیونکر وہاں تک ہمارے پیچھے آن پہنچے میں نے سوچا کہ اُنہوں نے ہمیں بس پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور ہمارے ہاتھ میں

سمندر میں نہانے کے تھیلے تھے لیکن میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

عرب آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے اور اب وہ ہمارے بہت قریب تھے۔ ہم نے اپنی چال نہ بدلی لیکن ریموں نے کہا:

"اگر لڑائی ہو گئی تو میسن۔ تم اس دوسرے سے نپٹ لینا۔ میں اپنے پُرانے دشمن پر گُرد پڑوں گا۔ اور تم مرسو! اگر ایک اور آن پہنچا تو تم اس پر پل پڑنا۔"

میں نے کہا —"جی ہاں!"

میسن نے اپنے ہاتھ جیب میں ڈال لیے۔ تپتی ہوئی ریت اب مجھے آگ کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ ہم برابر عربوں کی جانب بڑھتے رہے۔ ہمارے درمیان ہر لمحہ فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ جب ہم ایک دوسرے سے صرف چند قدم دُور رہ گئے تو عرب رُک گئے۔ میسن اور میں نے اپنی رفتار کم کر لی۔ ریموں سیدھا اپنے حریف کی جانب بڑھا مجھے ٹھیک سنائی تو نہ دیا کہ اُس نے اُسے کیا کہا ہے مگر عرب نے اُس کے سر پر ایک مکّا رسید کیا جس کی آواز آئی۔ پھر ریموں نے پہلی مرتبہ اسے ایک تھپڑ مارا اور فوراً میسن کو آواز دی۔ میسن اس آدمی تک جا پہنچا اور اسے دو مرتبہ پورے زور سے پاؤں سے تاڑا۔ عرب پانی میں اوندھے منہ گر پڑا اور چند سیکنڈ اسی طرح پڑا رہا۔ اس کے سر کے اردگرد پانی کے بلبلے سطح پر آکر ٹوٹ رہے تھے۔ اس اثنا میں ریموں نے بھی دوسرے آدمی کی مار پٹائی کی اور اُس کا منہ خون سے لت پت ہو گیا۔ ریموں میری طرف مڑا اور کہا:

"تم دیکھو گے میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

میں چلّایا:

"خبردار! اس کے پاس خنجر ہے۔"

مگر اس سے پہلے ہی ریمون کا بازو اور چہرہ زخمی ہو چکا تھا۔ میسن سامنے سے کودا مگر دوسرا عرب پانی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھی کے پیچھے جو مسلح تھا چھپ گیا۔ ہم ہلنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دونوں ہماری طرف مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہے اور ہمیں خنجر کے رُعب سے ایک فاصلے پر رکھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب میدان کھلا ہے تو وہ سرپٹ بھاگ نکلے۔ ہم دھوپ میں ساکت کھڑے رہے۔ ریمون کے زخمی بازو سے خون ٹپک رہا تھا اور وہ کہنی کے اوپر اپنے بازو کو زور سے دبائے ہوئے تھا۔

میسن نے فوراً کہا:

"میدان میں ایک ڈاکٹر ہے جو اتوار کا دن ہمیشہ وہیں گزارتا ہے۔"

ریمون فوراً اس کے یہاں جانا چاہتا تھا مگر ہر مرتبہ جب وہ بات کرتا تو اُس کے زخم کے خون کی وجہ سے اس کے منہ میں بلبلے بن جاتے۔ ہم نے اُسے سہارا دیا اور جلد از جلد بنگلہ پر لوٹ آئے۔ وہاں ریمون نے کہا کہ اس کے زخم گہرے نہیں ہیں اور وہ ڈاکٹر کے یہاں تنہا جا سکتا ہے۔ وہ ماسون کے ساتھ گیا اور میں گھر پہ ہی رہا تاکہ عورتوں کو سمجھا سکوں کہ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ مادام میسن رو رہی تھی اور ماری کا رنگ بہت زرد پڑ گیا تھا۔ مجھے انہیں سمجھانے میں بہت پریشانی ہوئی۔ آخرکار میں خاموش ہو گیا اور سمندر کی طرف دیکھتے دیکھتے سگریٹ پیتا رہا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ریمون میسن کے ساتھ لوٹ آیا۔ اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کے منہ کے ایک کونے میں پلاسٹر لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے

اُس سے کہا تھا کہ زخم معمولی ہیں، مگر ریمون بہت فکرمند معلوم ہو رہا تھا۔ میسن اُسے ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سارا وقت خاموش رہا۔ جب اُس نے کہا کہ وہ نیچے سمندر کے کنارے ٹہلنے جا رہا ہے تو میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ وہ کچھ ہوا خوری کے متعلق بڑبڑایا۔ میسن اور میں نے اُس سے کہا کہ ہم بھی اُس کے ساتھ چلیں گے۔ پھر اُسے طیش آ گیا اور وہ ہمیں گالیاں بکنے لگا اور کہا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔!

میسن نے کہا:

"اس کی مزاحمت نہیں کرنا چاہئے۔"

بہرحال جب وہ باہر نکلا تو میں اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

باہر بالکل تنور کی طرح تھا۔ دھوپ جلے ہوئے مادّے کی طرح ریت اور سمندر پر گر رہی تھی۔ ہم ساحل پر کافی دیر تک چلتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ ریمون کو معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے مگر یہ قیاس بالکل غلط نکلا۔ ساحل کے آخری کنارے پر ہم ایک چھوٹی سی ندی پر پہنچے جو ریت میں ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے بہہ رہی تھی۔ وہاں ہم نے دونوں عرب پائے۔ وہ لیٹے ہوئے تھے۔ اپنے میلے خاکستر لبادوں میں۔ وہ بالکل پُرسکون معلوم ہو رہے تھے اور تقریباً خوش۔ ہمارے آنے سے انہیں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ عرب جس نے ریمون کو مارا تھا بغیر کچھ کہے اسے ٹکٹکی باندھ کر تکتا رہا۔ دوسرا ایک چھوٹی سی بانسری بجاتا رہا۔ ہمیں آنکھ کے ایک کونے سے دیکھتا رہا اور اپنے ساز کو جو صرف تین ہی تانیں نکال سکتا تھا مسلسل بجاتا رہا۔

کچھ عرصہ کوئی نہ ہلا۔ اس دوران وہاں دھوپ اور خاموشی کے علاوہ صرف چھوٹی سی ندی اور تانوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر ریمون نے اپنا ہاتھ جیب میں رکھا اور

پر رکھا مگر عرب اپنی جگہ سے نہ ہلے اور مسلسل اُسے دیکھتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ بانسری بجانے والے عرب کے پاؤں کی انگلیاں بہت پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے پاؤں کے ساتھ تقریباً زاویہ قائمہ بنا رہی تھیں۔ ریموں نے اپنے حریف کو نظر انداز کیے بغیر مجھ سے پوچھا:

"میں اسے جا لوں؟"

میں نے ایک دم سوچا کہ اگر میں نے نہ کر دی تو وہ کہیں اشتعال میں آ کر اُسے نشانہ نہ بنا دے۔ میں نے اسے صرف یہ کہا:

"اُس نے ابھی تم سے کوئی بات نہیں کی۔ اگر تم یونہی اُس کو نشانہ بنا دو گے، تو سزاوار ٹھہرو گے۔"

پھر پانی اور بانسری کی ایک ہلکی سی آواز گرم اور خاموش فضا کی موجوں پر بہتی ہوئی کانوں میں پڑی۔ ریموں نے کہا:

"اب میں اسے گالی بکنے لگا ہوں۔ اگر اُس نے مجھے لوٹ کر جواب دیا تو میں اس پر پل پڑوں گا۔"

میں نے جواب دیا:

"ٹھیک ہے لیکن اگر اُس نے اپنا خنجر نہ نکالا تو تم گولی نہیں چلاؤ گے۔"

ریموں کو کچھ طیش آنے لگا۔ دوسرا عرب بانسری بجا تا رہا اور دونوں ساتھی ریموں کی ہر حرکت کو غور سے دیکھتے رہے۔

"نہیں!" میں نے ریموں سے کہا۔ "تم ریوالور مجھے دے دو اور دائیں طرف والے عرب سے ہاتھا پائی کر لو۔ اگر دوسرے نے مداخلت کی یا اُس نے اپنا خنجر

نکالا تو میں اس پر وار کر دوں گا۔"

جب ریموں نے مجھے اپنا ریوالور دیا تو اس پر سُورج کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ ہم بہر حال اس طرح ساکت رہے، جیسے کہ ہمارے ارد گرد کا ماحول ہمیں قید و بند کے عالم میں گھیرے ہوئے ہے۔ ہم صرف ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے آنکھیں جھکائے بغیر۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سمندر اور سُورج کے درمیان ریت کے اس مختصر سے ٹکڑے پر ساری زندگی آ کر رُک گئی ہے۔ ندی اور بانسری کی دوہری خاموشی۔ میں نے اس وقت سوچا کہ گولی چلانی چاہیے یا نہیں۔ مگر عرب ایک دم پیچھے ہٹ گئے اور چٹان کی آڑ میں چھپکلی کی طرح چھپ گئے۔ ریموں اور میں دونوں مڑے اور پھر سے اپنی راہ گئے۔ اب وہ ذرا بہتر محسوس کر رہا تھا اور بس پر واپس جانے کا ذکر کر رہا تھا۔ میں اُس کے ساتھ بنگلہ تک گیا۔ جب وہ لکڑی کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو میں پہلی ہی سیڑھی کے سامنے رُک گیا۔ میرا سر دھوپ کے مارے چکرا رہا تھا اور مجھے ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک منزل طے کرنے کی کوشش کروں اور پھر عورتوں سے نپٹوں۔ مگر گرمی کچھ ایسے غضب کی تھی کہ آسمان سے برستی ہوئی آگ کے نیچے ساکت کھڑے رہنا بھی عذابِ جان تھا۔ یہیں رُکوں یا آگے بڑھوں۔ بار بار یہی خیال آ رہا تھا۔ ایک لمحہ کے بعد میں سمندر کی طرف لوٹ آیا اور میں نے پیدل چلنا شروع کر دیا۔

جہاں تک نگاہ پہنچتی تھی وہی سُرخ روشنی تھی۔ گرم ریت پر سمندر کا سانس پھول رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی لہروں کا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے چٹان کی طرف ہولے ہولے قدم اٹھانا شروع کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا ماتھا دُھوپ سے

سُورج رہا ہے۔ گرمی مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھی اور میرے قدم روک رہی تھی۔ ہر مرتبہ جب میں اپنے چہرہ پر شدید گرمی کا ریلہ محسوس کرتا تو میں اپنے دانت بھینچ لیتا۔ پتلون کی جیب کے اندر اپنے ہاتھ مکّے کی صورت میں بند کر لیتا اور اپنے سارے اعصاب کو گرمی سے بچانے کی خاطر سکیڑ لیا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی جس میں میرا جسم جھلس رہا تھا۔ ریت سے آنے والے گرمی کے ہر ریلہ پر جو شمشیر کی تیزی سے آتا میرے جبڑے ایک سفید سیپی یا ٹوٹے ہوئے شیشہ کی طرح سکڑ جاتے مگر میں ہار ماننے والا تو نہیں تھا۔ میں بہت دیر چلتا رہا۔

میں نے دُور سے دیکھا کہ چھوٹی سی گہرے رنگ کی چٹان کے اردگرد سُورج کی روشنی اور سمندر کی جھاگ سے ایک چمکدار حلقہ سا بن رہا ہے لیکن مجھے پہاڑی کے پیچھے تازہ اور ٹھنڈے پانی کی ندی کا خیال آیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے بہتے ہوئے پانی کی نرم اور مترنم آواز سننے لوٹ جاؤں "تاکہ سورج سے پناہ مل سکے۔ مجھے عورتوں کا رونا بھی یاد آیا اور آخر کار جی چاہا کہ کوئی سایہ تلاش کروں اور اس کے تلے آرام کروں۔ میں یوں کرنے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ریموں کا دشمن لوٹ آیا ہے۔

اب کی مرتبہ وہ تنہا تھا۔ اُس نے کمر ٹیک رکھی تھی۔ ہاتھ گردن پر تھے منہ پہاڑی کے سامنے میں اور سارا جسم دھوپ میں اس کا نیلا لباس گرمی میں دھواں دار نظر آ رہا تھا۔ مجھے ذرا تعجب ہوا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جھگڑا ختم ہو چکا ہے۔ اور میں بے دھیان وہاں چلا آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی عرب ذرا اٹھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے۔ طبعی طور پر میں نے ریموں کا ریوالور تھاما، جو

میری واسکٹ کی جیب میں تھا۔ پھر نئے سرے سے وہ پیچھے ہٹا مگر ہاتھ جیب سے نہ نکالے۔ میں اس سے کافی دُور تھا، کوئی دس گز کے فاصلہ پر۔ مجھے کبھی کبھی اس کی آنکھیں جو اس کی گھنی بھوؤں میں دھنسی ہوئی تھیں، دکھائی دیتیں۔ مگر بیشتر اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا رہا۔ ایسی فضا میں جہاں شعلے بھڑک رہے تھے، لہروں کا شور پھر دھیما پڑ گیا۔ دوپہر سے بھی زیادہ دھیما۔ وہی سُورج تھا، وہی ریت اور وہی دھوپ۔ وقت طول کھینچ رہا تھا۔ دو بج چکے تھے، مگر دن اب بھی ڈھل نہیں رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وقت نے پگھلے ہوئے دھات کے سمندر میں لنگر ڈال دیا ہے۔ دُور اُفق پر کوئی جہاز گیا۔ کہیں ایک ہلکا سا بادل کا ٹکڑا گزر جاتا اور میں سمجھتا کہ ایک سیاہ نکتہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے کیونکہ میں عرب کو مسلسل ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ چند اور قدم میں میرا سفر ختم ہو جائے گا مگر سمندر کا کنارہ تھا کہ دھوپ میں کانپ رہا تھا اور ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے ندی کی طرف چند قدم بڑھائے۔ عرب نہ ہلا۔ ہمارے درمیان ابھی کچھ فاصلہ باقی تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے چہرے پر سایہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہا ہے۔ میں انتظار میں رہا۔ سُورج کی تپش نے میری گالوں کو جلانا شروع کیا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے ابروؤں پر پسینہ کی بوندیں جمع ہو رہی ہیں۔ یہ گرمی بالکل ویسی ہی تھی جیسے کہ امّی کے جنازہ کے دن۔ آج بھی اس دن کی طرح ماتھے میں مجھے سب سے زیادہ درد ہو رہا تھا اور جلد کے نیچے تمام رگیں زور سے پھڑپھڑا رہی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی پھٹنے کو ہیں۔

گرمی اب ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ میں نے سامنے کی طرف ایک قدم اٹھایا

میں جانتا تھا کہ یہ حماقت کی بات ہے۔ کیونکہ ایک قدم بڑھانے سے مجھے گرمی سے تو نجات نہ مل سکے گی، اگر میں نے ایک قدم اٹھایا — صرف ایک قدم سامنے کی طرف اور پھر بغیر اٹھے عرب نے اپنا خنجر نکالا جو دھوپ میں چمکا۔ فولاد کی دھار سے سورج کی شعاع نکلی اور لمبا چمکیلا پھل مجھے سامنے دکھائی دیا اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے ماتھے پر پیوست ہو گیا ہے۔ پسینہ جو میرے ابروؤں پر جمع ہو رہا تھا ایک دم میرے پپوٹوں پہ بہنے لگا اور ان پر ایک نیم گرم بھاری سا پردہ پڑ گیا۔ میری آنکھیں نمکین آنسوؤں کے سیلاب میں غرق ہو گئیں۔ مجھے اب اپنے منہ پر سورج کے طمانچوں کے سوا اور کچھ محسوس نہ ہو رہا تھا۔ خنجر کی خیرہ کن چمک مبہم طور پر میرے سامنے تھی۔ یہ چمکتی ہوئی شمشیر میرے پپوٹوں میں چبھ رہی تھی اور میری دکھتی ہوئی آنکھوں میں دھنس رہی تھی۔ یہ ابھی ایک دھندلا سا خاکہ تھا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سمندر میں ایک تند و تیز طوفان اٹھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سارا آسمان پھٹ پڑا ہے اور ہر جگہ اس سے آگ برس رہی ہے۔ میں ہمہ تن تناؤ کے عالم میں تھا۔ میں نے ریوالور کو اپنے ہاتھ میں دبایا۔ اس کا گھوڑا اپنی جگہ سے ہلا۔ میں نے چکنی ہوئی نشانے کی مکھی کو چھوا اور آن کی آن میں ایک شور بلند ہوا جس سے کان پھٹ رہے تھے۔ یوں سب کچھ شروع ہوا۔ میں نے پسینہ پونچھا۔ میں سمجھا کہ میں نے وقت کے توازن کو تباہ کر دیا ہے۔ سمندر کے کنارے جہاں اب تک ایک غیر معمولی خاموشی طاری تھی اور میں بڑے مزے میں تھا، اب حالت ہی اور ہو چکی تھی۔ میں نے پھر چار دفعہ گولی چلائی، ایک ایسے جسم پر جو بے حرکت تھا جہاں گولیاں لگ رہی تھیں اور اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ چار مختصر گھونسے تھے جو میں نے بدبختی کے دروازے پر رسید کیے۔

۷

میری گرفتاری کے فوراً بعد مجھ سے کئی بار پوچھ گچھ کی گئی۔ تفتیش کرنے والے میری شناخت اور نام و نشان کے متعلق تھوڑا عرصہ سوال کرتے اور پھر چلے جاتے۔ پہلی مرتبہ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ تھانے میں کسی کو میرے مقدمہ میں دلچسپی نہیں ہے۔ برعکس اس کے آٹھ روز بعد جب مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے مجھے بہت توجہ اور غور سے دیکھا۔ لیکن شروع میں اس نے صرف مجھ سے میرا نام، پتہ، پیشہ، پیدائش کی تاریخ اور جگہ دریافت کی۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا میں نے کوئی وکیل کر لیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں:

میں نے سوال کیا:

"کیا وکیل کرنا لازمی ہے؟"

"آپ کا مطلب؟" وہ چونکا۔

میں نے جواب دیا:

"مجھے اپنا مقدمہ بہت سیدھا سادہ معلوم ہوتا ہے۔"

وہ یہ کہتے ہوئے مسکرایا:

"یہ آپ کی رائے ہے۔ بہرحال قانون کا تقاضا اپنی جگہ قائم ہے۔ اگر آپ اپنا وکیل نہیں کریں گے تو ہمیں سرکاری وکیل نامزد کرنا ہوگا۔"

میں نے اُس سے کہا:

"اگر قانون یوں سب تفصیلات کی تاکید اور نگرانی کرتا ہے تو یہ تو بڑے انصاف کی بات ہے۔"

اُس نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا:

"ہاں قانون بہت خوب وضع کیا گیا ہے۔"

پہلے تو میں نے سوچا کہ وہ سنجیدہ نہیں ہے۔ اُس کے یہاں میری پیشی ایک کمرہ میں ہوئی جس میں پردے کھینچے ہوئے تھے۔ اس کے میز پر صرف ایک لیمپ تھا۔ جس کی روشنی اس کرسی پر پڑ رہی تھی جس پر مجھے بیٹھنے کو کہا گیا تھا۔ اس کا اپنا چہرہ تاریکی میں تھا۔ میں نے کتابوں میں اس قسم کے منظر پڑھ رکھے تھے اور یہ سب مجھے ایک کھیل سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہماری گفتگو کے بعد میں نے اسے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ اُس کے نقش بڑے تیکھے ہیں۔ نیلی نیلی گہری آنکھیں، بلند قامت، لمبی اور گھنی سفید مونچھیں اور بکھرے ہوئے سر کے بال جو برف کی طرح سفید تھے۔ وہ مجھے بہت معقول آدمی لگا۔ ہمدردی اور غمگساری کی خصوصیات نے اس کے بشرے پر شفقت کا تاثر پیدا کر دیا تھا۔ صرف ایک چیز مجھے اچھی نہ لگی۔ اعصابی درد سے اس کے منہ پر گاہے گاہے سکڑنے کی ایک اضطراری کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور اُس کا چہرہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ نکلتے ہوئے میں اُس کی طرف ہاتھ بڑھانے ہی کو تھا کہ مجھے یاد آیا کہ میں تو ایک قاتل ہوں۔

اگلے دن ایک وکیل جیل میں مجھ سے ملنے آیا۔ وہ پست قد اور گول مٹول تھا۔

خاصا ہوشمند، کالے بال احتیاط سے سنوارے ہوئے۔ گرمی کے باوجود (میں قمیص پہنے ہوئے تھا) وہ گہرے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سخت کالر اور ایک اوٹ پٹانگ شوخ قسم کی ٹائی جس میں بڑی بڑی کالی اور سفید دھاریاں تھیں۔ اُس نے اپنا تھیلا، جو وہ بغل میں دبائے ہوئے تھا میری چارپائی پر رکھ دیا۔ اپنا تعارف کروایا اور مجھ سے کہا، کہ اُس نے میرے مقدمہ کے کاغذات کا مطالعہ کیا ہے۔ میرا معاملہ نازک ہے مگر اسے کوئی شبہ نہیں کہ اگر میں نے اس پر اعتماد کیا تو ہم مقدمہ جیت جائیں گے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس نے مجھ سے کہا:

"اب معاملہ کی تہ کو پہنچیں۔"

وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ میری ذاتی زندگی کے متعلق اطلاعات حاصل کی گئی ہیں۔ یہ تو اُسے معلوم ہی تھا کہ میری ماں حال ہی میں بوڑھوں کی رہائش گاہ میں مری ہے۔ پھر بھی اُس نے مارنگو جاکر تفتیش کی۔ تحقیقات کرنے والوں کو پتہ چلا کہ میں نے امّی کے دفن کے دن بے حس اور سنگدل ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

"آپ جانیئے!" میرے وکیل نے مجھ سے کہا، "مجھے آپ سے یہ پوچھتے ہوئے کچھ اُلجھن سی محسوس ہوتی ہے مگر یہ بات بہت اہم ہے اور اگر مجھ سے اس کا جواب نہ بن آیا تو استغاثہ کو بڑی تقویت حاصل ہوگی۔"

وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی مدد کروں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اُس دن مجھے کچھ غم محسوس ہوا تھا۔ اس سوال پر میں بہت حیران ہوا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر مجھے کسی کو یہ سوال پوچھنا ہوتا تو مجھے بہت شرم محسوس ہوتی۔ بہرحال میں نے جواب دیا کہ کچھ عرصہ سے مجھے اپنے نفس کا تجزیہ کرنے کی عادت بھول چکی ہے۔ لہٰذا میرے

لئے بہت مشکل ہے کہ میں آپ کو اس ضمن میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاؤں۔ بے شک مجھے امّی سے بہت محبت تھی مگر یہ تو بے معنی بات ہے۔ سب ذی فہم، سمجھدار لوگ اپنے عزیزوں کی موت کی کبھی نہ کبھی کم و بیش تمنّا کیا ہی کرتے ہیں۔ یہاں وکیل نے مجھے ٹوکا۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ایسی بات عدالت میں نہیں کروں گا۔ بہرحال میں نے اُسے وضاحت سے بتایا کہ میری فطرت ہی ایسی ہے کہ میری جسمانی حالت میرے جذبات اور احساسات کو اکثر پراگندہ کر دیتی ہے۔ جس دن میں نے امّی کو دفن کیا تھا میں بہت تھکا ہارا تھا اور مجھ پر نیند غالب آ رہی تھی کچھ اس طرح کہ اب میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس دن مجھ پہ کیا گزری۔ میں پورے یقین سے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں اس کو ترجیح دیتا کہ امّی سرے سے فوت ہی نہ ہوتیں۔ مگر میرا وکیل مطمئن نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"یہ تو کافی نہیں ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر مجھ سے پوچھا:

"کیا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اُس دن میں نے اپنے قدرتی جذبات کو دبا کر رکھا تھا؟"

میں نے کہا:

"نہیں! کیونکہ یہ بات غلط ہے۔"

اُس نے مجھے ایک عجیب نفرت آمیز طریقے سے دیکھا اور تقریباً عناد کے انداز میں کہا:

"بہرحال ہسپتال کے ڈائریکٹر اور ملازم گواہی دیں گے اور ان کے بیان سے میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

میں نے اُس سے کہا:

"اس کہانی کا میرے مقدمہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔"

لیکن اُس نے صرف مجھے یہ جواب دیا:

"صاف ظاہر ہے کہ تجھے کبھی عدالت سے واسطہ نہیں پڑا۔"

وہ غصّہ کے عالم میں رخصت ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اُسے روکوں اور سمجھاؤں کہ مجھے اس کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ میری اچھی طرح عذرداری کرے گا مگر یوں کہئے کہ محض اس لئے کہ یہ ایک قدرتی تقاضا ہے۔ مگر ستم یہ ہوا کہ میں نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ مجھے سمجھ نہ پایا مگر وہ چاہتا تھا کہ مجھے کچھ سمجھے۔ مجھے یہ خواہش تھی کہ وہ اس بات کی تصدیق کرے کہ میں دوسرے لوگوں کی طرح سیدھا سادا آدمی ہوں۔ مگر درحقیقت یہ سب کچھ بے فائدہ تھا اور میں نے محض سُستی سے اس بات کی پیروی نہیں کی۔

کچھ عرصہ بعد مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پھر سے پیش کیا گیا۔ دوپہر کے دو بجے تھے۔ اس مرتبہ اس کا کمرہ روشنی سے بھرپور تھا اور وائل کا ہلکا پردہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ گرمی بہت تھی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بڑی تہذیب سے مجھے بتایا کہ میرا وکیل کسی وجہ سے ابھی تک پہنچ نہیں سکا لیکن مجھے حق حاصل ہے کہ میں وکیل کے آنے تک کسی سوال کا جواب نہ دوں۔ میں نے کہا:

"میں تنہا جواب دے سکتا ہوں۔"

اس نے میز پر انگلی سے ایک بٹن کو دبایا۔ عدالت کا ایک جوان منشی میرے پیچھے آ کر بیٹھ گیا۔

مجسٹریٹ اور میں —— ہم دونوں بازو والی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی فریم میں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ سوال جواب شروع ہوئے اس نے پہلے کہا کہ بیان کیا گیا ہے کہ میں بہت کم گو اور ساکت قسم کا آدمی ہوں۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس بارے میں میری کیا رائے ہے۔ میں نے جواب دیا:

"نہیں! واقعہ یوں ہے کہ میرے پاس کبھی زیادہ باتیں کہنے کو نہ تھیں۔ لہٰذا میں چُپ چاپ رہتا ہوں۔"

وہ پہلی مرتبہ کی طرح مسکرایا اور بھانپ گیا کہ میری دلیل معقول ہے۔ پھر اُس نے کہا:

"بہر حال اس کی کوئی اہمیت نہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ مجھے دیکھتا رہا اور پھر آناً فاناً بہت تیزی سے اُس نے کہا:

"جس بات میں مجھے دلچسپی ہے وہ آپ کی ذات ہے۔"

میں ٹھیک طور پر سمجھ نہ سکا کہ اُس کا مطلب کیا ہے اور میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

"بہت سی باتیں ہیں۔" اُس نے مزید کہا "جو آپ کے مقدمہ میں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ انہیں سمجھنے میں میری مدد کریں گے۔"

میں نے کہا:

"بات سب سیدھی سادی ہے۔"

اُس نے اصرار کیا کہ میں اپنا سفر پھر سے بیان کر دوں۔ میں نے پھر سے وہی بیان دُہرایا جو پہلے دے چکا تھا —— ریمون، ساحل، ہمارا تیرنا، جھگڑا، پھر ساحل، چھوٹی سی ندی، سُورج اور ریوالور کے پانچ وار۔ ہر جملہ پر وہ کہتا رہا "خوب، خوب!"

جب میں بیان کے آخر تک پہنچا تو اُس نے توصیفی انداز میں کہا:

"خوب ——!"

میں ایک ہی کہانی دہرا دہرا کر ہلکان ہو چکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی بھر میں نے پہلے کبھی اتنی باتیں نہیں کیں۔

کچھ خاموشی کے بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے کہا کہ وہ میری امداد کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہوں اور خدا کی مدد شامل حال رہی تو میرے لئے ضرور کچھ کرے گا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھ سے چند ایک سوال کرے۔ ایک لمحہ رُکے بغیر اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے واقعی امّی سے محبت تھی۔ میں نے کہا:

"ہاں: جیسے سب کو ہوتی ہے۔"

عدالت کا منشی جواب تک اپنی مشین پر باقاعدہ ٹائپ کر رہا تھا، اپنی چال بھول گیا۔ کیونکہ وہ بوکھلا اُٹھا تھا۔ اب مجبوراً اُسے آخری حصّہ کو پھر سے ٹائپ کرنا پڑا۔ پھر مجسٹریٹ بغیر کسی واضح منطق کے مجھ سے یہی پوچھتا رہا کہ میں نے ریوالور سے ایک دم پانچوں گولیاں کیوں چلا دی تھیں۔ میں نے سوچا اور بے کم و کاست کہا:

"میں نے صرف ایک گولی چلائی تھی اور پھر کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد باقی چار۔"

"آپ پہلے اور دوسرے وار کے درمیان رُک کیوں گئے تھے؟" اُس نے پھر پوچھا۔

پھر ایک مرتبہ میری آنکھوں کے سامنے وہی سُرخ ساحل آ گیا اور میں نے اپنے ماتھے پر سُورج کی تپش محسوس کی۔ مگر اب کی بار میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس خاموشی کے دوران مجسٹریٹ بہت پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بال پراگندہ تھے۔

اُس نے اپنی کہنی میز پر ٹیکی اور ذرا میری جانب جھکا عجیب و غریب کیفیت کے ساتھ
"تو کیوں؟ آخر کیوں آپ ایک لاش پر گولیاں چلاتے گئے؟"

ایک بار پھر مجھے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ مجسٹریٹ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور اپنے سوال کو بدلی ہوئی آواز میں دُہرایا:

"کیوں؟ آپ کو مجھے جواب دینا ہوگا۔ کیوں؟"

میں تمام وقت خاموش رہا۔

وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے بڑے قدم لے کر اپنے دفتر کے ایک کونے کی طرف بڑھا اور فائلوں کی الماری کا ایک دراز کھولا۔ وہاں سے اُس نے چاندی کی ایک صلیب نکالی اور میری طرف بڑھتے ہوئے اُسے گھمایا اور ایک بالکل بدلی ہوئی تقریباً کانپتی ہوئی آواز میں چلّایا:

"اس کو تم پہچانتے ہو؟"

میں نے کہا:

"جی ہاں: بے شک!!"

پھر اُس نے بڑی تیزی سے جذباتی لہجے میں کہا:

"میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ کوئی انسان اتنا گنہگار نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کی بخشش سے محروم ہو جائے لیکن لازم ہے کہ انسان احساس ندامت سے ایک معصوم بچے کی طرح بن جائے تاکہ اس کی رُوح سب رحمتوں کو قبول کر سکے۔"

اس کا سارا جسم میز پر جھکا ہوا تھا —— وہ صلیب میرے سامنے گھماتا رہا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کا مطلب نہ سمجھ پایا۔ اوّل تو گرمی بہت لگ رہی تھی پھر

اس کے دفتر میں بڑی کا بڑی مکھیاں تھیں جو مجھ پر آ کر بیٹھ رہی تھیں۔ اور پھر یہ بھی وجہ ہے کہ اُس نے مجھے کچھ ڈرا سا دیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ یہ ڈر فضول اور بے معنی ہے کیونکہ آخر کار میں ملزم تو ہوں ہی۔ اُس نے تقریر جاری رکھی۔ میں تقریباً یہ سمجھا کہ اس کی رائے میں میرے اقبال جُرم میں صرف ایک ہی نکتہ مبہم ہے یعنی یہ کہ میں ریوالور سے دوسرا وار کرنے سے پہلے کیوں رُک گیا تھا۔ باقی بیان واضح ہے لیکن یہ نکتہ وہ نہ سمجھ سکا۔

میں کہنے ہی والا تھا کہ وہ خواہ مخواہ ضد کر رہا ہے۔ اس آخری نکتہ کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں۔ مگر اُس نے بلند ہوتے ہوئے آخری مرتبہ ناصحانہ انداز میں بڑے رُعب اور دبدبہ سے پوچھا کہ کیا میں خدا پہ ایمان رکھتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ نہیں تو وہ بڑے غصّہ کی حالت میں پھر بیٹھ گیا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"یہ بالکل ناممکن ہے۔ تمام بنی نوع انسان خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ بھی جو اس سے روگردانی کرتے ہیں۔"

یہ اس کا عقیدہ تھا۔ اگر اس کو اس میں کبھی ذرہ بھر شک و شبہ ہوتا تو اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی۔

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ میری زندگی بے معنی ہو جائے؟" اُس نے کہا۔

میری رائے میں تو اس سوال کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا اور میں نے یہی اس کو کہہ دیا۔ وہ میز سے ہٹا اور عیسیٰ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کر کے ایک لایعنی طریقہ سے چلّایا:

"میں عیسائی ہوں۔ میں مسیح سے تمہارے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔ یہ کیسے

ہو سکتا ہے کہ تم اس پر ایمان نہ لاؤ جب کہ وہ تمہاری خاطر صلیب پر چڑھا۔ میں نے غور کیا کہ اب وہ آپ کی بجائے مجھے "تُو" کہہ رہا تھا لیکن میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ تپش بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میرا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ جب مجھے کسی سے پیچھا چھڑانا ہوتا ہے تو میں اس کی بات پر کان ہی نہیں دھرتا۔ مگر اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ میں اُس سے اتفاق کر رہا ہوں۔ میں حیران ہو گیا جب اُس نے فاتحانہ انداز سے کہا:

"دیکھا تم نے —— دیکھا تم نے۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ تم ایمان رکھتے ہو اور اب تم اس کے سامنے توبہ کرنے والے ہو۔"

ظاہر ہے کہ میں نے پھر ایک مرتبہ کہا:

"نہیں ——:"

وہ اپنی کرسی پر دھڑام سے گر پڑا۔ وہ بہت ہلکان نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہا جب کہ ٹائپ کی مشین جو سارے مکالمہ کو لکھتی رہی آخری فقروں کو محفوظ کر رہی تھی۔ پھر اُس نے مجھے ایک گونہ رنجیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اُس نے آہستہ سے زیرِ لب کہا:

"میں نے کبھی تم جیسا سنگ دل انسان نہیں دیکھا۔ تمام ملزم جو میرے سامنے پیش ہوتے ہیں ہمیشہ اس صلیب کے سامنے رو پڑتے ہیں کیونکہ یہ انسانیت کے درد کا مجسمہ ہے۔"

میں جواب دینے والا تھا کہ یہ ان کے بارے میں صحیح ہے جو ملزم ہیں لیکن میں نے سوچا کہ میں بھی تو انہی کے زمرہ میں شامل ہوں مگر مجرم ہونے کا یہ ایک خیال تھا جسے میں کسی طرح تسلیم نہ کر سکا۔

مجسٹریٹ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ بحث ختم ہوئی۔ اُس نے تھکے ہوئے انداز میں مجھ سے صرف یہ پوچھا کہ کیا میں اپنے کئے پر نادم ہوں۔ میں نے فکر کیا اور اُس سے کہا کہ ندامت تو کیا مجھے ایک گونہ بیزاری کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرا مطلب نہ سمجھ پایا۔ مگر آج کے دن کوئی بات بن ہی نہیں رہی تھی۔

اس کے بعد میں اکثر مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوتا رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب ہر بار میرے ساتھ میرا وکیل ہوتا اور ساری بحث میرے پہلے بیان کے صرف چند پہلوؤں کو واضح کرنے تک محدود رہتی یا یوں کہئے کہ مجسٹریٹ میرے وکیل سے فردِ جرم پر بحث کرتا۔ مگر درحقیقت اب وہ میری ذات سے کوئی دلچسپی نہ لیتا۔ بہر حال آہستہ آہستہ بحث کا لہجہ بدل گیا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ مجسٹریٹ کو اب میرے ساتھ کوئی ذاتی دلچسپی نہیں رہی اور اُس نے میرے مقدمہ کو تعزیرات کی کسی دفعہ میں ڈال دیا ہے۔ اُس نے پھر مجھ سے خدا کی بات نہیں کی اور میں نے پھر کبھی اُس کو پہلے دن کی سی گھبراہٹ اور کھلبلی کی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مقدمہ کی سماعت خوشگوار ہوتی گئی۔ صرف چند سوال میرے وکیل کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو اور پھر پیشی ختم۔ بقول مجسٹریٹ کے میرا مقدمہ اب اپنی ڈگر پر چل رہا تھا۔ کبھی کبھی جب گفتگو عام انداز کی ہونے لگتی تو مجھے ذرا تکلیف اور پریشانی ہوتی۔ مجھے پسینہ آنے لگتا۔ ان اوقات میں مجھے محسوس ہوتا کہ کسی کو مجھ سے دشمنی نہیں ہے۔ سارا ماحول بے تکلف، بے ساختہ، باضابطہ اور باسلیقہ تھا سارا کھیل کچھ اس سنجیدگی سے کھیلا جا رہا تھا کہ مجھے یہ مضحک خیال آتا کہ میں بھی اس کنبہ ہی کا ایک فرد ہوں۔

مقدمہ کے گیارہ ماہ کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ میں حیران ہوں کہ زندگی بھر

مجھے کبھی اتنی خوشی نہ ہوئی جیسی کہ میں ان نادر لمحوں میں محسوس کرتا۔ جب مجسٹریٹ مجھے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف پہنچا کر میرے کندھوں پر تھپکی دیتا اور ایک دوستانہ انداز میں کہتا:

"دجّال صاحب! آج کی کارروائی ختم ہوئی۔"

اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیتا۔

۸

کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر مجھے ہرگز گوارا نہیں ہے۔ جب میں جیل میں آیا تو چند ہی دن کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کے متعلق میں کبھی بات نہ کرنا چاہوں گا۔ مگر کچھ عرصہ بعد یہ جھجک اور ناحق کی بیزاری بے بنیاد سی ہو گئی۔ اصل میں شروع کے چند دن مجھے جیل میں ہونے کا احساس ہی نہیں تھا۔ مبہم طور پر کسی نئے اور خلاف توقع واقعہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اصل تغیر ماری کی پہلی اور آخری ملاقات کے بعد شروع ہوا۔ اس روز سے جب مجھے اس کا خط ملا (اُس نے لکھا تھا کہ مجھ سے پھر ملاقات کی اجازت نہیں مل سکتی کیونکہ وہ میری بیوی نہیں ہے) اُس دن سے مجھے احساس ہوا کہ اب جیل کی کوٹھڑی میرا گھر ہے اور میری زندگی یہاں آکر رک گئی ہے۔ میری گرفتاری کے دن انہوں نے مجھے ایک بڑے سے کمرہ میں بند کر دیا جہاں پہلے ہی بہت سے قیدی تھے جن میں سے اکثر عرب تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنسے۔ پھر اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے کہا:

"میں نے ایک عرب کو قتل کیا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ ایک لمحے بعد شام ڈھلی۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ جہاں

مجھے سونا ہے وہاں چٹائی کیونکر بچھاتا ہے۔ اگر ایک کونے کو پیٹ دیں تو وہ تکیہ کا کام دے گی۔ ساری رات کھٹمل اور کیڑے مکوڑے میرے منہ پر دوڑتے رہے۔ چند روز بعد انہوں نے مجھے ایک علیحدہ کوٹھڑی میں ڈال دیا، جہاں میں لکڑی کے ایک تختہ پر سوتا تھا۔ میرے پاس ایک کموڈ تھا اور ایک ٹین کا تسلا۔ جیل شہر کے سب سے اونچے مقام پر تھی۔ وہاں سے میں اپنی چھوٹی سی کھڑکی سے سمندر کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک دن میں اپنی کوٹھڑی کی سلاخوں کو تھامے ہوئے کھڑا تھا اور میرا چہرہ روشنی کی طرف تھا، جو موجوں سے کھیل رہی تھی کہ ایک سپاہی اندر آیا اور اُس نے کہا کہ میرا کوئی ملاقاتی آیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ ماری ہو گی۔ چنانچہ وہی تھی۔

ملاقات کا کمرہ دُور تھا۔ پہلے ایک غلام گردش سے گزر کے میں سیڑھیوں تک پہنچا۔ پھر ایک اور لمبا راستہ طے کرتے ہوئے ایک وسیع حال میں داخل ہوا، جو ایک بڑی کھڑکی کی وجہ سے خوب روشن تھا۔ لوہے کے دو بڑے جنگلے ہال کو لمبائی میں تین حصوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ دو جنگلوں کے درمیان ۱۰ سے ۱۵ گز کا فاصلہ تھا، جو قیدیوں کو ملاقاتیوں سے علیحدہ کرتا تھا۔ میں نے عین اپنے سامنے ماری کو پایا۔ اس کا لباس دھاریدار تھا اور اس کا چہرہ گندمی۔ جنگلے کی میری طرف تقریباً دس قیدی تھے۔ جن میں بیشتر عرب تھے۔ ماری کی طرف اکثر عرب عورتیں تھیں۔ وہ دو عرب عورتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی بڑھیا، لب بستہ، سیاہ لباس پہنے اور دوسری طرف ایک موٹی عورت جو بہت اشارے کر کر کے اُونچی اُونچی باتیں کر رہی تھی۔ چونکہ قیدیوں اور ملاقاتیوں کے درمیان فاصلہ خاصا تھا۔ مجھے بھی اپنی آواز بلند کرنا پڑی۔ آوازوں کا شور ہال کی بڑی بڑی برہنہ دیواروں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ تیز روشنی آسمان سے

چھن چھن کر کھڑکیوں سے گزرتی ہوئی ہال میں منعکس ہو رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اندر آتے ہی میرا سر چکرا سا گیا۔ میری کوٹھڑی اندھیری اور بہت خاموش تھی۔ لہٰذا مجھے اس نئی فضا میں سنبھلنے کے لئے کچھ وقت لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہر چہرہ صاف طور پر دکھائی دینے لگا۔

میں نے دیکھا کہ سپاہی غلام گردش میں جنگلوں کے درمیان دونوں کونوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیشتر عرب قیدی تھے اور اُن کے رشتہ دار جنگلے کی دوسری طرف ان کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ چلا نہیں رہے تھے۔ شور و غل کے باوجود وہ ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی دبی ہوئی سرسراہٹ جو کبھی بہت دھیمی ہو جاتی تھی، ایک مسلسل موسیقی کی بھنبھناہٹ پیدا کر رہی تھی۔ سر سے سر جوڑے وہ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بہت جلدی ان سب چیزوں کا جائزہ لیا۔ اور ماری کی طرف ایک قدم بڑھا۔ اُس کا سنولایا ہوا چہرہ سلاخوں کو چھو رہا تھا اور وہ مسکرانے کی بہت کوشش کر رہی تھی۔ اس لمحہ وہ مجھے بہت بھلی اور دلکش معلوم ہو رہی تھی لیکن مجھے اتنی عقل نہ آئی کہ اسے بھی یہ کہہ دوں۔

"ہیلو!" اُس نے مجھے بہت بلند آواز میں پکارا۔ "اچھا تو تمہارا کیا حال ہے؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

میں نے کہا:

"ہاں ——!"

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ماری بدستور مسکراتی رہی۔ موٹی عورت میرے ہمسایہ کی طرف جھک رہی تھی۔ وہ بلا شبہ اس کا میاں تھا۔ لانبا، گورا چٹا، سنہری بال،

اور شگفتہ سا آدمی۔ مندرجہ ذیل ان کی گفتگو کا ایک نمونہ ہے جو پہلے سے ہی جاری تھی۔

"ہمیں اسے نہیں لینا چاہیے۔" وہ زور سے چلّائی۔

"ہاں ہاں!" آدمی نے عورت سے کہا۔ "میں نے اُسے کہا بھی ہے کہ تو نکلتے ہی پھر اُسے واپس لے گا لیکن پھر بھی وہ نہیں مانتی۔"

ماری اپنی طرف سے چلّائی کہ ریموں نے مجھے سلام بھیجا ہے۔ میں نے کہا:

"شکریہ ۔۔۔!"

لیکن میری آواز میرے ہمسائے کی آواز میں گم ہو گئی جو پوچھ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہے؟ موٹی عورت یہ کہتے ہوئے ہنسی:

"اس کا حال کبھی اس سے بہتر ہی نہ تھا۔"

میری بائیں طرف کا ہمسایہ ایک منحنی نوجوان قیدی تھا جس کے ہاتھ نرم و نازک تھے۔ وہ بالکل خاموش رہا۔ میں نے غور کیا کہ وہ ایک چھوٹی سی بڑھیا کے مقابل کھڑا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو شدّت سے ترسی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے مگر مجھے ان کو زیادہ عرصہ دیکھنے کی فرصت نہ ملی کیونکہ ماری نے پھر چلّانا شروع کیا کہ مجھے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میں نے کہا:

"ہاں ۔۔۔!"

ساتھ ہی میں اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ اُس کے نفیس لباس تلے اس کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھوں اور اس کے جسم کو چھو لوں۔ اس کے سوا اور میری خواہش کیا ہو سکتی تھی۔ ماری کو بھی اس سے اتفاق معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ میری طرف دیکھ کر سارا وقت مسکراتی رہی۔ میں صرف اُس کے دانتوں کی چمک اور اُس

کی آنکھوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی شکنیں دیکھ رہا تھا۔ ماری پھر سے چلّائی:

"انشاءاللہ تو رہا ہو جائے گا۔ اور پھر ہماری شادی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا:

"تمہیں یقین ہے؟"

مگر یہ جملہ میں نے محض کوئی بات کرنے کی خاطر کہہ دیا تھا۔ اُس نے پھر بہت جلدی اور بلند آواز میں کہا:

"ہاں! تم رہا ہو جاؤ گے اور ہم دوبارہ اتوار کو ایک ساتھ نہانے جائیں گے۔"

مگر دوسری عورت نے جنگلے کی اپنی طرف سے چلّا کر اپنے میاں کو کہا کہ وہ ایک ٹوکری باہر جیل کی ڈیوڑھی میں اُس کے لئے چھوڑ آئی ہے اور پھر اس نے گننا شروع کیا کہ ٹوکری میں اس نے کیا کیا رکھا ہے۔ اُس نے اُسے تاکید کی کہ سب چیزیں ٹھیک سے دیکھ لینا کیونکہ وہ بہت قیمتی ہیں۔ میرا دوسرا ہمسایہ اور اس کی ماں ابھی تک ایک دوسرے کو سوگوار انداز میں دیکھ رہے تھے۔ ہمارے قریب عربوں کی کھُسر پھُسر تمام وقت جاری رہی۔ باہر بڑی کھڑکی پر روشنی تیز پڑ رہی تھی۔ میری طبیعت کچھ خراب ہو رہی تھی اور میں رخصت ہونا چاہتا تھا۔ شور سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ مگر دوسری طرف میں یہ بھی چاہتا تھا کہ ماری کی موجودگی کا فائدہ اٹھاؤں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وقت کیونکر گزر گیا۔ ماری مجھ سے اپنے کام کی باتیں کرتی رہی اور مسلسل مسکراتی رہی۔ غل غپاڑہ، چیخم دھاڑ، بات چیت اور سرسراہٹ سب کی باہم آمیزش جاری رہی۔ صرف خاموشی کا ایک جزیرہ میرے پہلو میں تھا۔ ایک پست قد جوان آدمی اور یہ بڑھیا جو ایک دوسرے کو تک رہے تھے آہستہ آہستہ انہوں نے عربوں کو ایک ایک کر کے لے جانا شروع کیا اور جونہی پہلا آدمی

رخصت ہوا۔ تقریباً سب پر خموشی چھا گئی۔ منمنی بڑھیا بھی سلاخوں پر جھکی ہوئی تھی کہ سپاہی نے اس کے بیٹے کے کندھے پر تھپکی دی۔ اس نے کہا:

"خدا حافظ اتی!"

اور بڑھیا نے خدا حافظ کرنے کے لئے ہاتھ سلاخوں کے بیچ میں ڈال دیا اور دیر تک وہیں کھڑی رہی۔

وہ گئی ہی تھی کہ ایک اور آدمی ہاتھ میں ٹوپی لئے اس کی جگہ آ کھڑا ہوا۔ میرے پاس جو خالی جگہ تھی وہاں کوئی ایک قیدی کو اندر لایا اور وہ اس سے پُر تپاک باتیں کرنے لگا لیکن دبی آواز میں کیونکہ کمرہ میں اب نسبتاً خاموشی چھا رہی تھی۔ کوئی میرے دائیں طرف کے ہمسائے کو دیکھنے آیا۔ اس کی بیوی بدستور چلا رہی تھی گویا کہ اس نے محسوس ہی نہیں کیا کہ اب چیخنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ کہہ رہی تھی:

"اپنا خیال خوب رکھنا"

پھر میری باری آئی۔ ماری نے اشارہ کیا جیسے کہ وہ مجھ سے بغل گیر ہو رہی ہے۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ اس کا منہ جنگلے کا سہارا لے رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں ایک عصبانیت اور پریشانی تھی۔

چند روز بعد اس نے مجھے ایک خط لکھا اور یہی ابتدا تھی اس کیفیت کی جس کے متعلق میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ بہر نوع مبالغہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور آخر دوسروں کی نسبت مجھے تکلیف بھی کم تھی۔ قید کے شروع شروع میں مجھے جو بڑی مشکل پیش آئی وہ یہ تھی کہ میرے خیالات ایک آزاد انسان کے تھے۔ مثال کے طور پر میرا جی چاہتا تھا کہ ساحل کے کنارے چلا جاؤں اور سمندر کی طرف اتر جاؤں۔ میں

اپنے دھیان میں پہلی لہروں کے شور کو اپنے پاؤں تلے محسوس کرنے لگتا کہ ایک دم مجھے خیال آتا کہ جیل کا سمندر میری طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا اٹھ رہا ہے۔ یہ کیفیت کئی مہینے رہی۔ اس کے بعد میرے خیالات ایک قیدی کے خیالات بن گئے۔ میں ہر روز اس وقت کا انتظار کرنے لگا۔ جب کوٹھڑیوں کے باہر دالان میں قیدیوں کو تھوڑی دیر چہل قدمی کی اجازت ملتی ہے یا پھر میں اپنے وکیل کا منتظر رہتا۔ دوسروں کی طرح میرا وقت بھی اسی طرح گزرنے لگا۔ مجھے اکثر خیال آتا کہ اگر کبھی مجھے ایک خشک درخت کے تنے میں زندگی بسر کرنا پڑے تو مجھے اس کی بھی آہستہ آہستہ عادت ہو جائے گی اور کسی دوسری مصروفیت ——— مثلاً اپنے سر کے اوپر آسمان کی چھت کو دیکھنا ——— کی احتیاج نہ رہے گی۔ میں پرندوں کی پرواز، بادلوں کے ٹکراؤ کا انتظار کرتا رہتا اور اپنے وکیل کا منتظر رہتا جس کی ٹائیاں عجیب وضع کی تھیں۔ ایک دوسری دنیا میں بڑے صبر سے اتوار کا انتظار کرتا تاکہ اس دن ماری سے ہم آغوش ہو سکوں۔ خوب غور کیا جائے تو میں ایک خشک درخت کے تنے میں تو نہ تھا۔ دنیا میں بہتیرے ہیں جو مجھ سے بھی بُری حالت میں ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہ امی کا ایک مقولہ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ انسان کو آخر کار ہر بات کی عادت ہو جاتی ہے۔

میری زندگی معمول سے ایسی بعید نہ تھی۔ پہلے چند مہینے ضرور سخت تھے اور مجھے انہیں گزارنے میں بڑی ہمت کرنی پڑی۔ مثلاً عورت کی خواہش نے مجھے سخت پریشان کیا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ میں جوان تھا۔ مجھے ماری کا خاص طور پر کبھی خیال نہ آیا۔ خیال صرف عورت کا آتا تھا ——— کوئی عورت ——— ان سب عورتوں کا جنہیں میں جانتا تھا۔ سب واقعات جن سے مجھے لگاؤ تھا یاد آتے۔ میری کوٹھڑی ہر قسم کے چہروں سے معمور ہو گئی اور میرا

جنسی خواہشات کے بھوت پریت سے بھرپور۔ ایک طرح سے میرا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا مگر دوسری طرف دفع الوقتی کا سامان میسر آ گیا۔ آخر کار مجھے حوالدار کی ہمدردی حاصل ہو گئی۔ وہ کھانے کے وقت باورچی خانے کے لڑکوں کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ پہلے میں نے اُس سے بھی عورتوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"سبھی پہلے پہل اس بات کی شکایت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا:

"میں بھی اُن ہی کی طرح ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سلوک غیر منصفانہ ہے۔"

"لیکن!" اُس نے کہا "اسی لئے تو آپ کو جیل میں ڈالا گیا ہے اور کس لئے۔ مگر ہاں آزادی، وہ اور بات ہے۔ اب آپ کو آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے۔"

میں نے کبھی یوں نہیں سوچا تھا مگر میں نے اُس کے ساتھ اتفاق کیا۔

"یہ سچ ہے۔" میں نے اُس سے کہا، "ورنہ سزا کیا ہوتی۔"

"ہاں! تم سمجھدار آدمی ہو۔" اُس نے کہا، "بہرحال دوسرے کسی نہ کسی طرح گزارہ کر ہی لیتے ہیں۔ وہ اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

اور وہ ساتھ ہی مجھے تسلی کے چند لفظ کہہ کے چلا گیا۔ اگلے روز میں نے دوسروں کی طرح اپنی مدد آپ کی۔

اور سگریٹ بھی ایک امتحان تھا۔ جب میں جیل میں آیا تو انہوں نے میری پیٹی، جوتوں کے تسمے، ٹائی اور سب چیزیں جو جیب میں آ سکتی تھیں، خاص طور پر سگریٹ مجھ سے لے لئے تھے۔ جونہی مجھے علیحدہ کوٹھڑی ملی میں نے پوچھا:

"کیا میری چیزیں مجھے واپس مل سکتی ہیں؟"

مجھے بتایا گیا:

"وہ جمع کر دی گئی ہیں اور سگریٹ نوشی بہرحال ممنوع ہے۔"

پہلے چند دن تو بڑی سختی سے گزرے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میری طبیعت بہت بجھی بجھی سی رہتی تھی۔ میں نے اپنی چارپائی کے تختے سے چند چھپٹیاں نکالیں اور انہیں چوستا رہا۔ دن بھر مجھے متلی سی محسوس ہوتی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ایک ایسی چیز جس سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا مجھ سے کیوں چھین لی گئی ہے۔ بہت دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی سزا کا ایک حصہ ہے لیکن جلد ہی مجھے عادت ہو گئی کہ سگریٹ کے بغیر ہی کام چلا سکوں اور پھر یہ سب میرے لئے کوئی سزا نہ رہی۔

ان تکالیف کے علاوہ مجھے کوئی پریشانی نہ تھی۔ سب سے اہم مسئلہ وقت گزارنے کا تھا لیکن یہ پریشانی بھی جاتی رہی جب میں نے اپنی یادوں کا سہارا لینا سیکھ لیا۔ کئی مرتبہ اپنے گھر کے کمرے کو یاد کرتا اور خیال ہی خیال میں وہاں جانے کے لئے ایک کونے سے چل پڑتا اور رستہ میں ہر چیز کو ذہنی طور پر گنتا چلا جاتا۔ پہلے پہلے تو یہ سفر جلدی کٹ جاتا مگر کئی مرتبہ جب میں دوبارہ یہ سفر طے کرتا تو کچھ طویل ہو جاتا۔

اپنے گھر کے کمرے کا سارا فرنیچر میرے ذہن میں تھا۔ کہاں کیا چیز دھری ہے ہر چیز کی پوری تفصیل کیا ہے اور تفصیلات بھی اتنی مکمل ——— یعنی کس چیز پر کون سا ڈیزائن ہے۔ کہاں سے ٹوٹی ہے، کہاں درز یا شگاف آیا ہے۔ اس کا رنگ کیا ہے اس کی اندرونی دھاریاں کیسی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں کوشش کرتا کہ یہ فہرست بناتے ہوئے میرے خیالات کا تانتا نہ ٹوٹ جائے اور اشیاء کا یہ شمار مع تمام جزئیات

کے بالکل مکمل ہو جائے۔ ایسا عمل کہ چند ہفتوں کے بعد میں کئی گھنٹے اس شغل میں گزار دیتا اور میرے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ رہتی جو میرے ذہنی شمار میں نہ آئی ہو۔ لیکن جتنا میں نے زیادہ بوجھ دماغ پر ڈالا اتنی زیادہ چیزیں تفصیل سے میرے ذہن میں آنے لگیں اور میرا حافظہ رفتہ رفتہ بہتر ہو گیا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ انسان صرف ایک دن کی یادوں کے سہارے سو سال جیل میں گزار سکتا ہے۔ اسے یادوں کا وافر ذخیرہ چاہیے تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ ایک لحاظ سے یہ تلافی خوب تھی۔

اور نیند کا مسئلہ بھی لاینحل تھا۔ شروع شروع میں رات کو نیند ٹھیک نہیں آتی تھی اور دن میں تو بالکل ہی نہیں۔ آہستہ آہستہ میری راتیں بہتر ہوتی گئیں اور دن میں بھی نیند آنے لگی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ آخری مہینوں میں تو سولہ سے اٹھارہ گھنٹے تک روزانہ سوتا تھا۔ باقی رہ گئے چھ گھنٹے سو وہ کھانے پینے، ضروریات فطرت، اپنی یادوں اور چیکوسلواکیہ کی کہانی پڑھنے میں گزر جاتے۔

واقعہ یوں ہے کہ میرے گدے اور چارپائی کے تختے کے درمیان مجھے ایک پرانے اخبار کا ٹکڑا مل گیا جو تقریباً کپڑے سے چپکا ہوا تھا۔ فرسودہ، زرد رنگ اور ایک بھربھرا کاغذ۔ شروع میں ایک نوع کا قصہ تھا جو بیچ میں سے پھٹا ہوا تھا لیکن بعد میں چیکوسلواکیا کی کہانی شروع ہو جاتی تھی۔ ایک آدمی اپنے گاؤں سے قسمت آزمائی کے لئے باہر نکلا۔ پچیس برس کے بعد وہ دولت مند ہو کر گھر لوٹا۔ اس کے ساتھ بیوی اور ایک بچہ تھا۔ اس کی ماں اس کی بہن کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں میں ایک چھوٹا سا ہوٹل چلاتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی ماں کو بے خبری میں اچانک آکے لہٰذا وہ اپنی بیوی اور بچے کو ایک دوسری جگہ چھوڑ آیا۔ جب وہ ہوٹل میں داخل ہوا تو

اُس کی ماں نے اُسے نہ پہچانا۔ اُس نے مذاق کے طور پر کہا کہ وہ ایک کمرہ لینا چاہتا ہے اور ساتھ ہی اپنی دولت کی نمائش بھی کی۔ رات کو اُس کی ماں اور بہن نے اُسے ٹوماؤ قتل کر دیا اور اُس کی لاش دریا میں ڈال دی۔ صبح بیوی وہاں پہنچی اور اُس نے بغیر جانے کہ وہاں کیا گزری ہے مسافر کا نام و نشان بتایا۔ ماں نے پھانسی لے لی اور بہن کوئیں میں کود پڑی۔ میں نے بیسیوں مرتبہ یہ کہانی پڑھی۔ ایک طرف تو وہ بالکل انہونی بات تھی اور دوسری طرف بالکل فطری۔ بہرحال مسافر کی میری نظر میں کوئی وقعت نہ تھی کیونکہ اُسے یہ کھیل کبھی کھیلنا ہی نہ چاہیے تھا۔

میرے سونے کے اوقات، میری یادوں کے تحفے، اخبار کے تراشے کا مطالعہ، روشنی اور سائے کے اتار چڑھاؤ۔ ان سب کے طفیل میرا وقت کٹ رہا تھا۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ جیل میں انسان وقت کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ مگر یہ بات مجھے معقول معلوم نہ ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس نقطہ پر دن بیک وقت بڑے اور چھوٹے ہو سکتے ہیں۔ دن گزارنے کو تو بے شک طول پکڑتا ہے۔ مگر وقت اندر سے کچھ اس طرح پھولتا پھیلتا ہے کہ آخرکار بڑے اور چھوٹے دن کی حد ایک دوسرے میں گم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے نام کھو بیٹھتے ہیں۔ صرف آج بالکل محض نقطہ رہ جاتے ہیں۔ جو میرے لئے کچھ معنی نہیں رکھتے۔ جب ایک دن سپاہی نے مجھ سے کہا کہ میں وہاں پانچ مہینے سے ہوں۔ تو میں نے اس کا یقین تو کیا مگر بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میرے لئے تو ایک ہی مسلسل دن تھا جو میری کوٹھڑی میں چڑھتا ڈھلتا اور ہر روز میں ایک ہی سا کام کرتا۔ اس دن سپاہی کے چلے جانے کے بعد میں نے کھانے والے ٹین کو چمکا کر اس میں اپنا چہرہ دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سوگوار تھا۔ اگرچہ میں نے مسکرانے کی بہت کوشش

کی۔ میں نے ٹین کو مختلف زاویوں سے دیکھا۔ میں اپنے عکس کے سامنے بہت پریشان تھا۔ میں مسکرا رہا تھا اور وہ بدستور درشت اور غمزدہ تھا۔ دن ختم ہو گیا اور ایسی گھڑی آن پہنچی جس کا میں تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ایسی گھڑی جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ ایسا سماں جہاں شام کا شور خموشی کے جلوس میں جیل خانہ کی سب منزلوں کو ایک ہی جست میں طے کر جاتا ہے۔ میں سلاخوں والی کھڑکی کے پاس گیا اور ڈھلتی ہوئی شام کی آخری روشنی میں ایک مرتبہ پھر میں نے اپنے چہرے کے عکس کو غور سے دیکھا۔ وہ ابھی تک سنجیدہ تھا اور تعجب یہ ہے کہ اس لمحہ میں بھی افسردہ تھا۔ مگر ساتھ ہی کئی مہینوں میں پہلی مرتبہ میں نے واضح طور پر اپنی آواز سنی۔ میں نے اُسے پہچان لیا کیونکہ وہ ایک عرصہ سے میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور میں اب سمجھا کہ میں قید کے دوران اپنے آپ سے ہی باتیں کرتا رہا ہوں۔ اب مجھے اس بات کی سمجھ آئی جو اقتی کے دفن کے دن نرس نے مجھ سے کہی تھی نہیں! اس سے تو کوئی مفر نہیں۔ کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ زندان میں شام کیوں کر کٹتی ہے۔

۹

مجموعی طور پر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وقت کی رفتار کچھ بہت سست تھی۔ اب موسم گرما کی آمد آمد تھی اور مجھے احساس تک بھی نہ ہوا کہ گرمیوں کی ایک پوری رُت پہلے ہی گذر چکی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جونہی دن تپنے لگیں گے مجھ پر کوئی نہ کوئی نئی آفت آئے گی۔ میرا مقدمہ ہائی کورٹ کی آخری سیشن میں درج ہوا تھا اور حالیہ سیشن جون کے مہینے میں ختم ہو رہی تھی۔ جس دن میری پیشی ہوئی کڑاکے کی دھوپ پڑ رہی تھی۔ اندر جرح شروع ہو چکی تھی اور باہر سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میرے وکیل نے مجھے یقین دلایا کہ یہ بحث دو تین دن سے زیادہ نہیں چلے گی۔

"بہرحال!" اُس نے کہا "عدالت کارروائی جلدی کرے گی کیونکہ فیصلہ طلب مقدموں کی فہرست پر تمہارا مقدمہ سب سے اہم نہیں ہے۔ پدرکشی کا ایک مقدمہ اس کے فوراً بعد پیش ہونے والا ہے اور اس پر وقت خاصا لگے گا۔"

وہ مجھے صبح کے ساڑھے سات بجے لینے آئے۔ حوالات کی گاڑی مجھے ہائی کورٹ میں لے گئی اور دو سپاہی مجھے ایک چھوٹے سے کمرہ میں لے گئے جس میں اندھیرا سا معلوم ہوتا تھا۔ ہم انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک دروازہ کھلا۔ اس کے

عقب سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں۔ ملزموں کی طلب کی پکار، کرسیوں کا فرش پر چلنے کا شور و شغب، ایک ہلچل اور کھلبلی سی مچی ہوئی تھی جس سے مجھے ضلع کے میلے یاد آئے جہاں موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے اور پھر ہال سے رقص کے لئے کرسیاں وغیرہ ہٹائی جاتی ہیں۔

سپاہیوں نے مجھ سے کہا کہ ہمیں عدالت شروع ہونے کا انتظار کرنا ہے۔ ان میں سے ایک نے مجھے سگریٹ کی پیش کش کی مگر میں نے قبول نہ کی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد مجھ سے پوچھا کہ کیا میں گھبرا رہا ہوں۔ میں نے جواب دیا نہیں اور یہ صحیح بھی تھا۔ کیونکہ ایک طرح سے مجھے عدالتی کارروائی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے زندگی بھر کبھی ایسا موقع نہ ملا تھا۔

"شاید—!" دوسرے سپاہی نے کہا "مگر ایک دو گھنٹے بعد آدمی تھک کر چور ہو جاتا ہے اور اکتا جاتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد کمرہ میں بجلی کی ایک گھنٹی ہلکی سی بجی۔ انہوں نے میری ہتھکڑی کھول دی۔ ایک دروازہ کھلا اور میں ملزموں کے کٹہرا میں داخل ہوا۔ عدالت تماشائیوں سے بھرپور تھی۔ اگرچہ سرکیاں گری ہوئی تھیں دھوپ جھریوں سے اندر آ رہی تھی اور اس سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ کسی نے شیشے کی کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں۔ میں بیٹھ گیا اور سپاہی میری کرسی کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ اس لمحہ میں نے سامنے چہروں کی ایک قطار پائی۔ سب میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھا کہ یہ جیوری ہے میں انہیں فرد کی حیثیت سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے تو وہ سب ایک جیسے دکھائی دیتے تھے۔ میرا تاثر کچھ یوں تھا جیسے کہ ٹرام میں کسی سواری کا، اُسے سامنے بیٹھے

ہوئے لوگوں کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں سارے بے نام مسافر ہر نو وارد کو تاڑتے ہیں اور اسے بہت مضحکہ خیز پاتے ہیں۔ مجھے خوب علم تھا کہ یہ واہیات خیال ہے۔ کیونکہ یہاں تمسخر نہیں بلکہ جُرم کے آثار کی تلاش تھی۔ تاہم دونوں میں فرق زیادہ نہیں ہے۔ بہر حال یہی خیال تھا جو مجھے سوجھا۔

بند کمرہ میں ایک خاص مجمع تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے عدالت کے کمرہ میں نظر دوڑائی مگر مجھے کوئی جانا پہچانا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ مجھے پہلے تو یقین نہ آیا کہ یہ ساری خلقت صرف مجھے دیکھنے کے لئے جمع ہوئی ہے۔ عام طور پر تو لوگوں نے کبھی میری طرف توجہ نہیں دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں بڑی دقت محسوس ہوئی کہ کیا یہ ساری چہل پہل میری ہی خاطر ہے۔ لوگوں کی دلچسپی کا یوں مرکز بننا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے اپنے بائیں طرف کے سپاہی کو کہا:

"کتنا مجمع ہے ؟"

اُس نے جواب دیا:

"ہاں! یہ اخباروں کی وجہ سے ہے۔"

اور اُس نے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا جو جیوری کے بنچ تلے ایک میز کے قریب بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا:

"وہ وہاں دیکھئے!"

میں نے پوچھا— "کون؟"

اور اُس نے دہرایا— "اخبار نویس!"

وہ اُن اخبار نویسوں میں سے ایک کو پہچانتا تھا۔ اس اخبار نویس نے اُسے

دیکھا اور ہماری طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ ایک معمر آدمی تھا، ہمدرد قسم کا۔ اس کے چہرے پر ایک کھسیانی سی ہنسی تھی۔ اُس نے سپاہی سے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا میں نے دیکھا کہ عدالت کے کمرے میں سب لوگ ایک دوسرے سے مل جل رہے ہیں وہ مختلف ٹولیوں میں گپ شپ کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ایک ملت میں سب لوگ خوش باش ہیں اور اپنی قسم کے لوگوں سے مخلع بالطبع ہو رہے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں یہاں ایک ناخواندہ مہمان ہوں جو رونق محفل ہونے کی بجائے دخل درمعقولات کر رہا ہے۔ اس اثنا میں اخبار نویس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے خطاب کیا۔ اُس نے امید ظاہر کی کہ میرا انجام بخیر ہوگا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے مزید کہا:

"آپ کو معلوم ہے ہم نے آپ کے مقدمہ کو ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے گرمی کا موسم اخباروں کے لئے مندا ہوتا ہے کیونکہ لکھنے کو بہت کم مواد ملتا ہے ورنہ آپ کی کہانی اور اس کے مجرم کی داستان جو آپ کے بعد آنے والا ہے، کچھ زیادہ اہم اور دلچسپ نہیں ہیں۔ آپ نے اس کے متعلق سنا ہی ہوگا۔ ایک پدر کش کا مقدمہ ہے۔"

پھر فوراً ہی اُس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا، جو اخبار نویسوں کے گروہ میں تھا اور الٹھ کر جا رہا تھا۔ یہ ایک منحنی سا آدمی تھا جس کی شکل ایک موٹے نیولے سے ملتی جلتی تھی۔ اُس نے سیاہ حلقوں کی ایک بڑی سی عینک پہن رکھی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ پیرس کے ایک اخبار کا خصوصی نمائندہ ہے۔

"مگر وہ آپ کی خاطر نہیں آیا۔ چونکہ اس کو دوسرے مجرم کی کارروائی اپنے

— اخبار کو بھیجنا تھی لہٰذا انہوں نے کہا کہ لگے ہاتھوں آپ کے مقدمے کی رپورٹ بھی تار سے بھیج دے۔"

میں کہنے ہی والا تھا کہ یہ تو اس کی بڑی مہربانی ہے۔ مگر میں نے سوچا کہ یہ تو فضول اور مہمل بات ہے۔ اُس نے ہاتھ سے مجھے ایک دوستانہ اشارہ کیا اور رخصت ہوا۔ ہم پھر چند منٹ انتظار کرتے رہے۔ اب کچھ ساتھیوں کے ہمراہ میرا وکیل آن پہنچا۔ وہ رسمی لباس میں تھا اور اس کے ارد گرد بہت سے دوسرے لوگ گفتگو کر رہے تھے۔ وہ اخبار نویسوں کے میز کی طرف بڑھا اور ان سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے کچھ مذاق کیا اور ہنسا۔ سب لوگ بڑے آرام اور سکون میں معلوم ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ججوں کی نشست گاہ میں گھنٹی بجی۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ میرا وکیل میری طرف آیا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے مشورہ دیا کہ جب وہ مجھ سے سوال کرے تو میں مختصر طور پر اُن کا جواب دوں اور اپنے طور پر ہرگز کوئی بیان شروع نہ کروں اور باقی سب معاملہ اس پر چھوڑ دوں۔

میں نے اپنی بائیں طرف ایک کرسی کے ہلنے کی آواز سنی۔ میں نے ایک بزرگ دُبلا پتلا آدمی دیکھا۔ وہ سُرخ لباس میں ملبوس تھا۔ عینک لگائے ہوئے وہ اپنا لباس پیٹتا ہوا بیٹھ گیا۔ یہ سرکاری وکیل تھا۔ ایک نقیب نے محترم ججوں کی آمد کا اعلان کیا اس وقت چھت میں ٹنگے ہوئے دو بڑے بڑے بجلی کے پنکھے حرکت میں آگئے۔ تین جج بغل میں دستاویزات دبائے ہوئے داخل ہوئے۔ دو سیاہ لباس میں تھے اور تیسرا سُرخ میں۔ وہ تیز رفتاری سے اپنی نشستوں کی طرف جو ہال میں ایک ممتاز بلند مقام پر تھیں بڑھے۔ جو آدمی سُرخ لباس میں تھا وہ درمیان والی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی رسمی

ٹوپی اتار کے سامنے میز پر رکھ دی۔ رومال کے ساتھ اپنی کھوپڑی پونچھی اور اعلان کیا کہ عدالت کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔

اخبار نویس پہلے ہی ہاتھ میں قلم تھامے ہوئے تھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ انہیں کسی شے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بڑے چالاک اور عیار نظر آتے تھے ان میں سے ایک تو بہت کم عمر تھا۔ اس کا لباس بھورے خاکستری رنگ کا تھا اور نکٹائی نیلی۔ وہ اپنے سامنے قلم دھرے بیٹھا تھا اور ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ کچھ موزوں اور مناسب نہ تھا۔ میری توجہ کا مرکز اس کی دو آنکھیں تھیں نیلے رنگ اور روشن جو بڑے غور سے میرا جائزہ لے رہی تھیں مگر یہ تاثر دیئے بغیر کہ وہ کس نتیجہ پر پہنچی ہیں۔ مجھے عجیب سا معلوم ہوا گویا کہ میں اپنا تجزیہ آپ ہی کر رہا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں عدالت کے آداب و رسوم سے بے بہرہ تھا۔ اس لئے کارروائی کے سب پہلو میری سمجھ میں ٹھیک نہیں آ رہے تھے۔ جیوری کے انتخاب کا طریقہ، صدر کی، میرے وکیل، سرکاری وکیل اور جیوری پر سوالوں کی بوچھاڑ (ہر مرتبہ جب وہ سوال کرتا ساری جیوری کے سر یک بیک عدالت کی طرف مڑ جاتے) فردِ جرم کا جلدی سے پڑھا جانا اس میں مجھے چند لوگوں اور جگہوں کے نام مانوس معلوم ہوتے اور پھر میرے وکیل سے ضمیمہ کے طور پر کچھ سوال کئے گئے۔ اس کے بعد صدر نے اعلان کیا کہ اب گواہوں کی فہرست پڑھی جائے گی۔ نقیب نے نام پڑھے اور میری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ کچھ نام سن کر تو میں حیران ہوا۔ جونہی اعلان ختم ہوا میں نے دیکھا کہ گواہ ایک ایک کر کے اٹھے اور پھر فوراً ہی بازو کے دروازے سے غائب ہو گئے ـــــ ہسپتال کا ڈائریکٹر، چوکیدار، بوڑھا تامس پریز، ریمون، میسن، سلمانو، ماری ـــــ آخر الذکر نے مجھے ہلکا سا عصبانی

اشارہ کیا۔ میں حیران تھا کہ میں نے اس سے پہلے انہیں کیوں نہیں دیکھا۔ جونہی اس کا نام پکارا گیا آخری گواہ سیلسط اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پہلو میں میں نے ریستوران والی خاتون کو پہچانا۔ وہ مردوں جیسا کوٹ پہنے ہوئے تھی اور اس کا انداز وہی فیصلہ کن، دوٹوک اور باضابطہ تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا مگر مجھے غور و فکر کی فرصت کہاں تھی۔ صدر نے پھر تقریر شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ بحث طلب امور پر اب جرح شروع ہو رہی ہے اور اسے پبلک سے یہ سفارش کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاموش اور پرسکون رہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نہایت غیر جانب داری سے صدارت کا فرض ادا کرے "تاکہ مقدمے کے سب پہلوؤں پر واقعی انداز میں غور کیا جا سکے۔ جیوری جو سزا تجویز کرے گی وہ عدل اور انصاف پر مبنی ہو اور بہرحال وہ معمولی سی معمولی بدنظمی ہونے کی صورت میں ساری عدالت کو خالی کرا دے گا۔

گرمی بڑھ رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ اخباروں سے ہوا کر رہے تھے۔ اس وجہ سے شکن دار کاغذوں کی ایک ہلکی سی مسلسل سرسراہٹ جاری رہی۔ صدر نے نقیب کو اشارہ کیا۔ اس نے اشارہ پاتے ہی ہاتھ کی تین پنکھیاں لا حاضر کیں جو تینوں ججوں نے فوراً استعمال کرنا شروع کر دیں۔

اب میری پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ صدر نے مجھ سے ایک پرسکون بلکہ خوشگوار لہجہ میں سوال کئے۔ پہلے تو ایک مرتبہ پھر مجھ سے میرے نام نشان کا اعلان کرایا گیا اگرچہ اس رسمی تکرار سے میں تنگ آ چکا تھا لیکن میں نے سوچا کہ درحقیقت فطری امر ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ غلطی میں کہیں ایک کی بجائے دوسرے کو سزا مل جائے۔ پھر صدر نے

فردِ جرم پڑھنا شروع کی۔ وہ مجھے خطاب کرتے ہوئے ہر دفعہ صرف تین لفظ کہتا:

"یہ صحیح ہے؟"

میں ہر مرتبہ اپنے وکیل کی ہدایت کے مطابق جواب دیتا رہا:

"جی ہاں صاحب صدر!"

اس کی تقریر لمبی ہو گئی کیونکہ وہ معمولی سی معمولی تفصیل بھی بیان کر رہا تھا۔ اس دوران میں اخبار نویس تیزی سے لکھتے رہے۔ ان میں جو سب سے کم عمر تھا میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ اُس عجیب سی منحنی عورت کی بھی جو مشین کی طرح تھی مگر جیوری کی نظریں سُرخ لباس والے جج پر تھیں۔

مجھے ٹرام کے مسافروں کا خیال آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جج نے ہلکی سی کھانسی کی۔ اپنی فائل کے ورق الٹائے اور اپنے آپ کو پنکھا کرتے ہوئے مجھ سے سنجیدگی سے خطاب کیا۔

صدر نے کہا کہ ضروری ہے کہ وہ اب مجھ سے کچھ ایسے سوالات کرے جو بظاہر میرے مقدمے سے غیر متعلق معلوم ہوتے ہیں لیکن در اصل ان کا معاملہ سے گہرا ربط ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ اب پھر وہ امی کے متعلق بات کرنے والا ہے اور ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ امر میرے لئے کس قدر پریشانی کا باعث ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے امی کو بوڑھوں کی رہائش گاہ میں کیوں ڈال رکھا تھا؟

میں نے جواب دیا:

"وجہ آسان ہے۔ گھر میں اُن کی دیکھ بھال کرنے کے لئے میرے پاس کافی رقم نہیں تھی۔"

پھر اُس نے مجھ سے پوچھا:

"اُن کی علیحدگی پر مجھے کچھ تکلیف نہ ہوئی؟"

میں نے جواب دیا:

"نہ امی نہ میں، یک دوسرے کے دستِ نگر تھے اور نہ ہی کسی اور کے محتاج۔ لہذا ہم دونوں اپنی نئی زندگی کے جلد ہی عادی ہو گئے تھے۔"

صدر نے پھر کہا کہ وہ اس نقطہ پر زیادہ اصرار نہیں کرے گا اور سرکاری وکیل سے دریافت کیا کہ اُسے مجھ سے اس مرحلہ پر کچھ اور سوال تو نہیں کرنا ہے۔

آخر الذکر نے نیم کر برٹی اور میری طرف نگاہ کئے بغیر کہا کہ وہ صاحب صدر کی اجازت سے یہ پوچھنا چاہے گا کہ کیا میں ندی کی طرف اکیلا اس نیت سے گیا تھا کہ وہاں ایک عرب کو قتل کر دوں۔

میں نے کہا — "نہیں!"

"پھر آپ مسلح کیوں تھے اور کیوں عین اسی مقام پر لوٹے؟"

میں نے کہا:

"یہ محض اتفاق کی بات تھی۔"

سرکاری وکیل نے ایک ناشائستہ لہجے میں کہا:

"فی الحال یہی کافی ہے۔"

اس کے بعد سب کو کچھ اُلجھن سی ہوئی۔ کم از کم میں ضرور پریشان تھا۔ لیکن وکیلوں کے ساتھ صلاح مشورہ کے بعد صدر نے اعلان کیا کہ عدالت اب برخاست ہوتی ہے اور گواہوں کی شہادتیں دوپہر کے بعد ہوں گی۔

مجھے سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ مجھے معلوم ہو کہ کیا ہو رہا ہے انہوں نے مجھے وہاں سے نکالا۔ عدالت کی گاڑی میں سوار کیا اور جیل لے گئے۔ جہاں میں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کوئی مجھے پھر لینے آگیا۔ بس اتنی سی مہلت ملی کہ میں کہہ سکوں کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب میں پھر عدالت کے اس کمرہ میں تھا اور میرے سامنے پھر وہی چہرے تھے۔ صرف گرمی زیادہ ہو گئی تھی۔ کسی کرامت سے اب ہر ایک شخص کے پاس پنکھیاں تھیں۔ جیوری کے پاس، سرکاری وکیل، میرا اپنا وکیل اور اخبار نویس سبھی کے ہاتھ میں پنکھے تھے۔ کم عمر اخبار نویس اور منحنی سی مشینی خاتون ابھی تک وہیں تھے۔ مگر وہ پنکھا نہیں کر رہے تھے اور بدستور مجھے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے اپنے چہرہ سے پسینہ پونچھا۔ مجھے ابھی نہ اپنی ہوش آئی تھی اور نہ اس جگہ کی جہاں میں تھا کہ نقیب نے ہسپتال کے ڈائریکٹر کو پکارا۔ اس سے سوال کیا گیا کہ کیا امّی کو اکثر مجھ سے شکوہ شکایت رہتی تھی۔ اُس نے کہا:

"ہاں! لیکن یہ تو سب پنشن خواروں کی عادت ہے کہ وہ اپنے اعزّہ و اقارب کی شکایات کرتے رہتے ہیں۔"

صدر نے اُسے کہا کہ وہ واضح طور پر بتائے کہ کیا امّی مجھ پر تہمت دھرتی تھیں کہ میں نے انہیں بڈھوں کے ہسپتال میں رکھ چھوڑا ہے

ڈائریکٹر نے پھر جواب دیا ـــ "ہاں ـــ!"

مگر اس مرتبہ اُس نے مزید کچھ اضافہ نہ کیا۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا کہ جنازے کے دن مجھے اس قدر ٹھنڈا اور پُرسکون دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا۔ کسی نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے کیونکر فیصلہ کر لیا کہ میں سرد مہر تھا۔ ڈائریکٹر نے

اپنی آنکھیں جھکائیں اور لمحہ بھر اپنے جوتوں کی نوک کی طرف دیکھا پھر اُس نے کہا کہ میں امّی کی لاش کو بالکل دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور میرا ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا اور میں جنازہ کے فوراً ہی بعد قبر پر فاتحہ پڑھے بغیر رخصت ہو گیا۔ ایک اور چیز سے اُسے بھی اچنبھا ہوا۔ جنازہ کی رسوم ادا کرنے والے ایک ملازم نے اُسے بتایا تھا کہ مجھے امّی کی عمر تک معلوم نہ تھی۔ ایک لمحہ کے لیے سکتہ پڑ گیا۔ صدر نے اُس سے پوچھا:

"کیا تم کٹہرے میں ملزم کے بارے میں بیان دے رہے ہو؟"

ڈائریکٹر کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ جج نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"یہ قانون ہے۔ میرا فرض منصبی ہے کہ یہ سوال پوچھوں۔"

پھر صدر نے سرکاری وکیل سے کہا کہ کیا اسے گواہ سے کوئی سوال پوچھنا ہے؟

اور سرکاری وکیل چہک اٹھا:

"جی نہیں! یہی کافی ہے۔"

اُس نے یہ کہتے ہوئے میری طرف ایک ایسی فاتحانہ نظر ڈالی کہ برسوں کے بعد پہلی دفعہ میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں۔ کیونکہ مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیوں کر سب لوگ نفرت کرتے ہیں۔

صدر نے جیوری اور میرے وکیل سے پوچھا کہ انہیں کوئی اور سوال کرنا ہے؟

پھر اُس نے چوکیدار کا بیان سننا شروع کیا۔ اُس کی باری بھی دیگر گواہوں کی طرح سب رسومات ادا ہوئیں۔ کٹہرے میں داخل ہوتے ہوتے چوکیدار نے میری طرف ایک نگاہ ڈالی اور پھر اُس نے نظریں پھیر لیں۔ اُس نے سوالوں کے جواب دیئے۔ اُس نے کہا میں نے امّی کی لاش کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں سگریٹ پیتے پیتے سو گیا تھا نیز یہ کہ میں نے

دودھ سمیت کافی پی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ساری عدالت میں نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اور میں پہلی مرتبہ سمجھا کہ میں واقعی مجرم ہوں۔ چوکیدار کو کہا گیا کہ وہ دودھ والی کافی اور سگریٹ نوشی کا قصہ دہرائے۔ سرکاری وکیل نے میری طرف رُخ کیا تو اُس کی آنکھوں میں طنز کی ایک چمک تھی۔ اس لمحہ میرے وکیل نے چوکیدار سے پوچھا کہ کیا اُس نے میرے ساتھ سگریٹ نہیں پیا تھا؟ مگر اس سوال پر سرکاری وکیل تندی سے اٹھ کھڑا ہوا اور شدت کے ساتھ سوال کی مخالفت کی۔ اُس نے کہا:

"یہاں مجرم کون ہے؟ اور کیا کیا حربے استعمال کئے جا رہے ہیں استغاثہ کے گواہوں کے خلاف؟ بیان ایسے وزن رکھتے ہیں کہ ان میں شبہ پیدا کرنے کی کوشش بالکل بے سود ہے۔"

اس اعتراض کے باوجود صدر نے چوکیدار سے تقاضا کیا کہ وہ سوال کا جواب دے۔ بڈھا بوکھلا سا گیا اور اُس نے کہا:

"مجھے خوب معلوم ہے کہ غلطی میری ہے لیکن جب صاحب نے مجھے سگریٹ پیش کیا تو میں انکار کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔"

آخری بار مجھ سے پوچھا گیا کہ مجھے کچھ اور کہنا ہے؟

"جی نہیں!" میں نے جواب دیا "صرف یہی کہ گواہ ٹھیک کہتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اس کو سگریٹ پیش کیا تھا۔"

چوکیدار نے مجھے ایک گونہ تعجب اور تشکر سے دیکھا۔ وہ جھجکا، پھر اُس نے کہا کہ دودھ والی کافی اُس نے مجھے پیش کی تھی۔ میرے وکیل نے فتح کے نشہ میں آسمان سر پر اٹھا لیا اور بآواز بلند اعلان کیا کہ اُسے امید ہے کہ جیوری اس بیان کی اہمیت کی

داد دے گی۔ لیکن سرکاری وکیل ایک گرج دار آواز میں چہکا:

"جی ہاں! جیوری ضرور اس کی اہمیت پہچانے گی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ ایک اجنبی تو غلطی سے کافی پیش کر سکتا تھا لیکن ایک بیٹے کو ایسی ہستی کی لاش کے سامنے جسے اس نے جنم دیا تھا، اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اس پیش کش کو ٹھکرا سکے۔"

چوکیدار اپنی جگہ پر لوٹ گیا۔

جب ٹامس پریز کی باری آئی تو ایک نقیب کو اُسے سہارا دے کر کٹہرے تک لانا پڑا۔ پریز نے کہا اگرچہ وہ میری والدہ کو خوب جانتا تھا، اُس نے مجھے صرف ایک دفعہ دیکھا تھا ــــ جنازے کے دن۔ اس سے پوچھا گیا کہ میرا سلوک اُس دن کیسا تھا، اُس نے جواب دیا:

"آپ جانتے ہیں کہ میں خود غم میں بہت مبتلا تھا۔ لہٰذا میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ میرا غم مشاہدہ میں مزاحم ہو رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ میرے عزیز دوست کی موت۔ دراصل جنازے کے دوران میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ لہٰذا میں ان صاحب کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکا۔"

سرکاری وکیل نے اُسے کہا کہ کم از کم اُس نے مجھے روتے تو دیکھا ہو گا۔ جب پریز نے کہا ہرگز نہیں۔ سرکاری وکیل نے اپنی طرف سے زور سے کہا:

"امید ہے جیوری اس بیان پر مناسب توجہ کرے گی۔"

مگر میرا وکیل اس پر برہم ہو گیا۔ اُس نے پریز سے ایسے لہجہ میں جو مجھے تشدد آمیز معلوم ہوتا تھا پوچھا کہ کیا وہ حلفیہ بیان دے سکتا ہے کہ میں نے ایک بھی آنسو نہیں بہایا۔ پریز نے جواب دیا ــــ "نہیں!"

اس پر کچھ لوگ ہنس پڑے اور میرے وکیل نے ایک آستین چڑھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا:

"اس کارروائی کی عجیب صورت ہے۔ سب کچھ سچ ہے اور کچھ بھی سچ نہیں۔ صحیح واقعات معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی جارہی ہے۔"

سرکاری وکیل نے کوئی توجہ نہ کی۔ وہ منہ بسورے بیٹھا رہا اور پنسل اٹھا کر اپنے کاغذات پر کچھ گھسیٹنے لگا — بالکل بے نیاز!!

پانچ منٹ کے التوا کے بعد جس کے دوران میں میرے وکیل نے مجھ سے کہا کہ سب کارروائی میرے موافق ہو رہی ہے۔ سلیسط کی آواز کان میں پڑی۔ وہ مدعا علیہ کی طرف سے گواہی دے رہا تھا اور مدعا علیہ میں تھا۔ وقتاً فوقتاً سلیسط میری طرف نگاہ ڈالتا۔ گواہی دیتے ہوئے وہ ہاتھوں میں اپنی ٹوپی کو بھینچ رہا تھا۔ وہ اپنا سب سے اچھا سوٹ پہنے ہوئے تھا جو وہ کبھی کبھی اتوار کے دن جب ہم اکٹھے گھوڑ دوڑ جایا کرتے تھے پہنا کرتا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنا کالر نہ لگا سکا کیونکہ قمیص کا گلا بند کرنے کے لئے اس نے صرف "تانبے کا ایک بٹن لگا رکھا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا میں اس کا گاہک ہوں؟

اس نے کہا:

"جی ہاں! لیکن ایک دوست بھی۔"

یوں وہ میرے متعلق سوچتا تھا اور اس نے جرح کے دوران کہا کہ میں ایک شریف شخص ہوں یہی میری شہرت ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ تو اس نے کہا کہ ساری دنیا اس کا مطلب سمجھتی ہے۔ اس نے یہ بھی بیان دیا کہ میں ایک

خاموش طبع، کم گو آدمی ہوں اور وہ صرف یہ جانتا ہے کہ میں یاوہ گوئی نہیں کرتا۔ سرکاری وکیل نے اس سے پوچھا کہ کیا میں باقاعدگی سے بل ادا کرتا ہوں سلیسط ہنسا اور اس نے کہا:

"جی ہاں! مگر یہ معاملہ تفصیلات کا ہے ہم دونوں کے درمیان، حساب و نشان دل۔"

اس سے پھر پوچھا گیا کہ میرے جرم کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ کٹہرے پر رکھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ کچھ کہنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس نے کہا:

"میری رائے میں یہ محض ایک حادثہ ہے۔ ایک بدبختی جو ساری دنیا جانتی ہے کہ کیا ہے۔ انسان کو اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر ہی نہیں سوجھتی۔ جی ہاں — میری نظر میں یہ ایک بدبختی ہے۔"

وہ تقریر جاری رکھنے والا تھا مگر صدر نے اسے ٹوک دیا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ پھر سلیسط گھبراہٹ میں کچھ دیر خاموش رہا مگر اس نے کہا کہ اس کا بیان ختم نہیں ہوا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس سے تقاضا کیا گیا کہ وہ اپنا بیان مختصر کرے۔ اس نے تکرار سے کہا کہ یہ محض ایک حادثہ ہے اور صدر نے اس سے کہا:

"جی ہاں! یہ تو طے ہے مگر ہم یہاں اس لئے ہیں کہ اس قسم کے حادثے کا قانون کے مطابق فیصلہ کریں۔ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

جب سلیسط اپنے علم و فضل اور نیک خواہی کا اظہار کر چکا تو میری طرف مڑا۔ ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آنکھیں مرطوب ہیں اور اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ وہ زبانِ حال سے مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ میرے لئے کچھ اور بھی کر سکتا ہے؟ میں نے کچھ نہ کہا نہ میں نے کوئی اشارہ کیا مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میرا جی چاہا کہ ایک مرد کا منہ چوم لوں۔ صدر نے اُس سے پھر کہا کہ وہ کٹہرے سے چلا جائے۔ سیلسط نیچے اتر کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ باقی سماعت کے دوران وہ وہیں بیٹھا کارروائی سنتا رہا، سامنے کی طرف جھکے ہوئے کہنیاں گھٹنوں پر دھرے اور اپنی ٹوپی ہاتھوں میں لئے، اُس نے ہر لفظ کو غور سے سنا۔

اب ماری داخل ہوئی۔ اُس کے سر پر ہیٹ تھا اور وہ اب بھی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ مجھے کھلے بالوں میں زیادہ بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جس جگہ میں تھا وہاں میں اس کی چھاتیوں کا ہلکا ہلکا بوجھ محسوس کر رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کا نچلا ہونٹ سارا وقت کچھ لٹکا ہوا سا ہے۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چھوٹتے ہی اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کب سے مجھے جانتی ہے۔ اُس نے اس زمانے کا ذکر کیا جب وہ ہمارے ساتھ دفتر میں کام کیا کرتی تھی۔ صدر نے اُس سے پوچھا کہ میرے ساتھ اُس کے کیا تعلقات تھے اُس نے کہا کہ وہ میری ایک دوست ہے۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے اُس نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے والی تھی۔

سرکاری وکیل نے جو اپنی فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا اس سے یکایک پوچھا کہ ہمارے جنسی تعلقات کس دن سے شروع ہوئے۔ اُس نے تاریخ بتائی۔ سرکاری وکیل نے بڑی لاپروائی کے انداز میں کہا کہ اس کا خیال ہے کہ یہ تاریخ اماں کے جنازے کے دوسرے دن کی تھی۔ پھر اُس نے کچھ طنزاً کہا کہ وہ ایک ایسے نازک معاملہ کے متعلق زیادہ اصرار نہیں کرے گا۔ وہ ماری کے تامل اور پس و پیش کو خوب سمجھتا ہے (اور یہاں اُس کا لہجہ

خاصا تلخ ہو گیا)، مگر وہ مجبور ہے کہ عام آدابِ شائستگی کو بالائے طاق رکھ کر اپنا فرض انجام دے۔ اُس نے پھر ماری سے تقاضا کیا کہ وہ اس دن کی پوری تفصیل بیان کرے جب پہلی بار ہماری جنسی ملاقات ہوئی تھی۔ ماری اوّل تو کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی مگر سرکاری وکیل کے اصرار پر اُس نے ہمارے باہم نہانے کا تذکرہ کیا۔ اس کے بعد ہمارا ایک ساتھ سینما جانا اور ہمارا اکٹھا میرے یہاں لوٹنا۔ سرکاری وکیل نے ماری کے بیان کے فوراً بعد کہا کہ وہ اس تاریخ کے پروگرام کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتا ہے۔ اُس نے کہا:

"ماری نے ماتحت عدالت میں بتایا ہے کہ وہ کس قسم کی فلم دیکھنے گئے تھے۔"

اُس نے خاصی کوری آواز میں کہا:

"واقعہ یہ ہے کہ وہ فلم فرنانڈل کی تھی (جو ایک مذاقیہ ہیرو ہے)۔"

جب اُس نے بات ختم کی تو عدالت میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر سرکاری وکیل بڑی سنجیدگی سے اٹھا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت جذباتی انداز میں آہستہ سے کہنے لگا:

"صاحبانِ جیوری! غور فرمائیے!! اپنی ماں کی موت کے دوسرے ہی دن یہ آدمی حمام میں جاتا ہے۔ ایک غیر قانونی جنسی تعلق کا آغاز کرتا ہے اور ایک مذاقیہ فلم میں جا کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں آپ کو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

وہ بیٹھ گیا اور خاموشی مسلسل چھائی رہی۔ لیکن یکایک ماری پھوٹ پڑی اور اُس نے سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ اُس نے کہا کہ حقیقت یوں نہ تھی بلکہ سچائی کچھ اور ہی ہے اس کو مجبور کیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف بیان دے۔ اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ وہ مجھے خوب جانتی ہے اور اُسے یقین ہے کہ میں نے کوئی خراب کام نہیں کیا۔

لیکن صدر کے اشارے پر نقیب اُسے لے گیا اور عدالت کی کارروائی جاری رہی۔

یہ منظر ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ میسن نے اعلان کیا کہ میں ایک دیانتدار آدمی ہوں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میں ایک بہادر آدمی ہوں لیکن کسی نے اُس کی ایک بات نہ سنی۔ یہ بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ سلمانو کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اُسے یاد ہے کہ میں نے اُس کے کتے کے ساتھ ہمیشہ نیکی کا سلوک کیا تھا۔ جب اُس سے میرے اور امّی کے متعلق سوال کیا گیا تو اُس نے کہا کہ میں درحقیقت اپنی ماں سے کم ہی بات کیا کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اُس کو بوڑھوں کی رہائش گاہ میں چھوڑ رکھا تھا۔ سلمانو نے کہا کہ اس بات کو صحیح طور پر سمجھنا چاہئے۔ صحیح سمجھنا چاہئے — صحیح سمجھنا چاہئے!! مگر معلوم ہوتا تھا کہ یہ بات کوئی نہ سمجھ سکا۔ اُس کو کہا گیا کہ وہ کٹہرے سے اتر جائے۔

پھر ریموں کی باری آئی۔ وہ آخری گواہ تھا۔ ریموں نے ہاتھ سے مجھے ہلکا سا اشارہ کیا اور پھر فوراً کہا کہ میں بے گناہ ہوں۔ مگر صدر نے کہا کہ وہ اُس کی رائے نہیں پوچھ رہا بلکہ واقعات دریافت کر رہا ہے۔ اُس سے کہا گیا کہ وہ سوالات کو غور سے سُنے اور ان کا ٹھیک جواب دے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ مجرم سے اپنے تعلقات واضح طور پر بیان کرے۔ ریموں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ آخری نفرت انگیز واقعہ کے بعد اُس نے نہ کہ میں نے عرب کی بہن کو پیٹا تھا۔ اس لئے مقتول کو میرے ساتھ بغض و عناد رکھنے کی کوئی وجہ تو نہیں تھی۔ ریموں نے کہا کہ اس دن ساحل پر میری موجودگی محض ایک اتفاق کا نتیجہ تھی۔ سرکاری وکیل نے پھر اُس سے پوچھا کہ اس کا کیا جواز ہے کہ وہ ڈرامائی خط جس کی وجہ سے سانحہ روپذیر ہوا اور جس کی اصل اس کے پاس موجود ہے۔ مجھ سے لکھوایا گیا ہے

ریموں نے جواب دیا:

"یہ بھی محض ایک اتفاق تھا۔"

سرکاری وکیل نے اُلٹ کر الزام لگایا کہ اس کہانی میں اتفاق سے پہلے ہی ضمیر پر بہت سے جُرم ہو چکے ہیں۔ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ کیا یہ اتفاق کی بات تھی کہ جب ریموں اپنی داشتہ کو پیٹ رہا تھا تو میں نے مداخلت نہ کی۔ کیا یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ میں نے گواہ کی تھانہ میں ضمانت دی اور کیا یہ بھی اتفاق ہے کہ اس گواہی کے بعد کے میرے سامنے بیانوں سے صاف صاف میری مروت ٹپکتی ہے۔ آخر میں ریموں سے اُس نے پوچھا کہ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ جونہی اُس نے جواب دیا "دکانداری" سرکاری وکیل نے جیوری کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گواہ بدنامِ عوام ہے اور اس کا پیشہ دلالی ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس کا گہرا دوست ہوں اور اس کے ساتھ اس جرم میں شریک ہوں۔ جُرم کا سارا پس منظر نہایت بھیانک ہے۔ یہ ایک بہت ذلیل اور پست کھیل ہے جو اس بات سے اور بھی سنگین ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے اس کو ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔ مجرم کی ساری شخصیت انسانیت سے معرا اور اخلاقی احساس سے بالکل عاری ہے۔ ریموں اپنے دفاع میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے وکیل نے احتجاج کیا لیکن اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ سرکاری وکیل کو بات ختم کرنے دے۔ آخر الذکر نے کہا:

"مجھے مزید بہت کم کہنا ہے۔ کیا مجرم تمہارا دوست ہے؟" اُس نے ریموں سے پوچھا۔

اُس نے کہا:

"ہاں! وہ میرا لنگوٹیا یار ہے۔"

پھر سرکاری وکیل نے مجھ سے بھی یہی سوال پوچھا۔ میں نے ریموں کی طرف نظر ڈالی۔

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ میں نے جواب دیا:

"جی ہاں!"

سرکاری وکیل نے پھر جیوری کی طرف رُخ کیا اور کہا:

"یہ وہی شخص ہے جو ماں کے جنازے کے دوسرے ہی دن اپنے آپ کو نہایت شرمناک بدکاری کے سپرد کر دیتا ہے۔ بغیر کسی معقول وجہ کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے تاکہ وہ اپنے مشتبہ اخلاق سے چھٹکارا پا سکے۔"

پھر وہ بیٹھ گیا۔ مگر میرے وکیل کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے چلّایا۔ کچھ اس طرح کہ اس کی آستینیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں اور اس کی کلف دار قمیص کی سلوٹیں ظاہر ہونے لگیں۔ اُس نے کہا:

"آخر کار مجرم پر الزام کیا ہے؟ ماں کو دفن کرنے کا یا ایک شخص کو قتل کرنے کا ــــ؟"

پبلک ہنس پڑی۔ مگر سرکاری وکیل نے پھر خطاب کیا۔ اُس نے اپنے رسمی لباس کو درست کرتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ سیدھی سادی بات نہ سمجھنے کے لیے جناب وکیل دفاع کا بھولا پن اور سادگی درکار ہے۔ دونوں تعلقات لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کے درمیان ایک گہرا افسوسناک اور حسرت ناک تعلق ہے۔

"جی ہاں!" اُس نے سختی سے کہا "میں اس شخص پر الزام عائد کرتا ہوں کہ اُس نے اپنی والدہ کو ایک معصیت بھرے دل کے ساتھ دفن کیا ہے۔"

اس تقریر کا پبلک پر خاصا اثر ہوا۔ میرے وکیل نے کندھے اچکائے اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ لیکن وہ بدحواس ہو رہا تھا اور مجھے خیال آیا کہ حالات

میرے موافق نہیں جا رہے۔

عدالت برخواست ہوئی۔ ہائی کورٹ سے حوالات کی گاڑی میں سوار ہونے کے لئے نکلتے ہوئے میں نے ایک مختصر لمحہ کے لئے باہر گرمیوں کی شام کی مانوس رنگ و بو کو پھر سے پہچانا۔ رواں جیل کی تاریک گمنامی میں مجھے اپنی تھکان کا شدت سے احساس ہوا اور ایسے میں ایک ایک کر کے اپنے محبوب شہر کے غل غپاڑے کی سبھی مانوس آوازیں میرے کان میں پڑیں اور اس عالم میں مجھے ایک عجیب راحت محسوس ہوئی۔ اخبار بیچنے والوں کا کھلی فضا میں تفریحی انداز میں آوازیں لگانا، چوک کے باغ میں آخری پرندوں کی چہک، سینڈ وِچ فروخت کرنے والے کی پکار۔ شہر کی بلندیوں پر ٹرام کا سخت موڑ مڑتے ہوئے نالہ و فریاد اور آسمان کی وہ مبہم سی سرسراہٹ جب رات سامنے بندرگاہ پر جھومنے لگے میرے لئے یہ سفر ایک اندھے کی مانند تھا جو زندان میں جانے سے پہلے اس راستہ کا چپّہ چپّہ پہچانتا ہو۔ بلاشبہ شام کی یہ گھڑی ایسی تھی جس میں مجھے ایک مدّت کے بعد راحت کا احساس ہوا۔ اب ایک ہلکی سی پُر سکون نیند میری منتظر تھی۔ ایسی نیند جس میں سپنوں کا نام و نشان نہ ہو۔ اس کے بعد میرے لئے سب چیزوں کی ماہیت بدل گئی۔ کل کا تصوّر اب جیل کی کوٹھڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جیسے موسم گرما میں مانوس راہیں معصوم اور میٹھی نیند کی منزل کا پتہ دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ زندان کی نشان دہی بھی کرتی ہیں۔

۱۰

اپنے متعلق باتیں سننا ہمیشہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے خواہ وہ ملزموں کے کٹہرے ہی میں کیوں نہ ہوں۔ سرکاری اور اپنے وکیل کی تقریریں سننے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے میرے متعلق باتیں تو بہت کیں مگر میری ذات کے متعلق زیادہ اور میرے جرم کے بارے میں کم۔ بہر حال ان دونوں تقریروں میں کچھ ایسا فرق نہ تھا۔ میرے وکیل نے ہمت ہار دی اور اقبالِ جرم کر لیا مگر جرم کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے عذر بہت پیش کئے۔ سرکاری وکیل نے ہمت نہ ہاری اور کھلم کھلا مجھے مجرم ٹھہرایا مگر کوئی عذر نہ پیش کیا۔ لیکن ایک چیز مجھے مبہم طور پر پریشان کر رہی تھی۔ اپنی تشویش اور بے چینی کے باوجود کئی بار بے اختیار جی چاہا کہ میں کارروائی میں مداخلت کروں مگر میرے وکیل نے یہ کہتے ہوئے مجھے روک دیا۔

"آپ خاموش رہئے۔ یہی آپ کے لئے بہتر ہے۔"

ایک طرح سے میں اپنے مقدمہ کو اپنی ذات سے خارج سمجھ رہا تھا اور میرا سلوک کچھ ایسا تھا جیسے کہ اس کا میرے ساتھ کوئی داخلی تعلق نہیں۔ مقدمہ میری مداخلت کے بغیر جاری رہا۔ میری قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا اور کسی نے میری رائے تک پوچھنا گوارا نہ کیا۔ وقتاً فوقتاً میرا جی چاہتا تھا کہ ساری کارروائی روک دوں اور کہوں :

"مگر آخر مجرم کون ہے؟ یہ مجرم کی موت اور زندگی کا سوال ہے اور مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں۔"

مگر غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔ بہر حال مجھے یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ عوام کی دلچسپی زیادہ دیر تک قائم نہ رہے گی۔ مثال کے طور پر میں سرکاری وکیل کی تقریر جلد ہی بھول گیا۔ صرف چند ٹکڑے، چند اشارے، چند ملامت آمیز فقرے۔ مجھے یاد رہ گئے تھے۔ مگر مجموعی طور پر میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

اس کا مافی الضمیر میری سمجھ میں خوب آ گیا۔ یہی کہ میں نے جان بوجھ کر جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ کم از کم اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ یہ ثابت کرے۔ جیسا کہ اُس نے کہا:

"حضرات! میں یہ ثابت کر دوں گا اور تکرار سے۔ پہلے تو واقعات کی چکا چوند روشنی میں اور پھر اس مجرمانہ ذہنیت کی نفسیات کے افسردہ اور اداس پہلوؤں کی روشنی میں ——!"

اُس نے امّی کی موت کے بعد کے واقعات گنوانا شروع کئے۔ اُس نے میری بے حسی، بے پروائی کا ذکر کیا۔ امی کی عمر کے سلسلہ میں میری جہالت کا بیان آیا۔ پھر اگلے دن میرا ایک لڑکی کے ساتھ غسل کرنا اور سینما جانا جہاں فرنانڈل کا مذاقیہ شو ہو رہا تھا اور آخرکار میرا ماری کے ساتھ اپنے گھر لوٹنا۔ میں گاہے گاہے اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہتا۔ کیونکہ وہ اُسے "داشتہ" کے لقب سے یاد کر رہا تھا اور میرے لئے وہ صرف ماری تھی۔ پھر اُس نے ریموں کا قصہ چھیڑا۔ میں نے سوچا کہ واقعات پر اس طرح نگاہ ڈالنے سے اُن کا تسلسل ٹوٹ نہیں جاتا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا بظاہر معقول معلوم ہو رہا تھا یہ صحیح ہے کہ میں نے ریموں کی رضامندی سے خط لکھا تھا تاکہ وہ اپنی داشتہ کی

توجہ اپنی طرف مبذول کر سکے اور ایک ایسا شخص جس کے اخلاق مشتبہ تھے۔ اسے اپنی سیرت کے بُرے پہلوؤں سے نجات پانے کا موقع مل سکے۔ میں نے ساحل پر ریمون کے دشمنوں کو اشتعال دلایا تھا۔ جھگڑے کے دوران وہ زخمی ہوا۔ میں نے اس سے اس کا ریوالور مانگا تھا اور میں محض اس کو استعمال کرنے کی نیت سے وہاں لوٹا تھا۔ میں نے عرب کو نشانہ بنایا تھا جیسا کہ میرا ارادہ تھا۔ پہلی گولی چلانے کے بعد میں وہاں انتظار کرتا رہا تاکہ مجھے یقین ہو جائے کہ کام واقعی تمام ہو گیا ہے۔ میں نے پھر جان بوجھ کر چار گولیاں بالکل سیدھی اور نہایت بے دردی سے چلائیں۔ یقینی طور پر یہ صاف ظاہر تھا کہ میں نے ایک طرح سے غور و خوض کر رکھا تھا۔

"حضرات!" سرکاری وکیل نے کہا، "میں نے آپ کے سامنے واقعات پیش کئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص نے سب کچھ جانتے اور پہچانتے ہوئے مقتول کو عمداً مارا ہے۔ یہ واقعہ ایسا نہیں ہے کہ کسی نے اشتعال میں آ کر غیر ارادی طور پر قتل کیا ہو اور ہیجان کی حالت جُرم کی سنگینی کو ہلکا کر سکے۔ میں اس بات کو تاکید سے کہہ رہا ہوں۔"

اُس نے کہا:

"کیونکہ یہ شخص ایک معمولی کلرک نہیں ہے کہ آپ حالات میں تخفیف کر سکیں کہ جرم کا ارتکاب سوچے سمجھے بغیر کیا گیا ہے۔ یہ فرض کرنا بالکل ناممکن ہے کہ جب اُس نے جُرم کا ارتکاب کیا اُسے احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔"

"حضرات! یہ آدمی ذہین ہے۔ اس سے آپ ضرور اتفاق کریں گے۔ وہ الفاظ کے معنی پہچانتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے حالات کا

جائزہ لئے بغیر کیا ہے؟"

میں سنتا رہا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ وہ مجھے ذہین گردانتا ہے۔ مگر میں یہ سمجھ نہ سکا کہ وہ خصلت جو ایک عام آدمی میں خوبی سمجھی جاتی ہے، ایک ملزم میں وہی خوبی اس کے خلاف کسی جُرم کے شرمناک الزامات لگانے میں کیونکر اس شدت سے استعمال کی جا سکتی ہے۔ کم از کم مجھے اس سے اُلجھن ضرور ہوئی اور پھر میں سرکاری وکیل کی باقی تقریر پر دھیان نہ رکھ سکا۔ حتیٰ کہ میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سُنا:

"کیا اُس نے اظہارِ ندامت کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ حضرات سماعت کے دوران ایک مرتبہ بھی یہ آدمی اپنے نفرت انگیز جُرم پر نادم نظر نہیں آیا۔"

اس لمحہ وہ کٹہرے کی طرف مڑا اور میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے اپنی زور دار تقریر کو جاری رکھا۔ بے شک مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہ تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ میں اپنے کئے پر کچھ زیادہ پشیمان نہ تھا مگر اس کے بغض و عناد پر مجھے ضرور تعجب ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کو دوستانہ طور پر بلکہ محبت کے ساتھ یہ سمجھانے کی کوشش کروں کہ سچی بات یہ ہے کہ میں زندگی بھر کبھی کسی چیز پر پشیمان نہیں ہوا۔ مجھے جو کچھ بھی پیش آیا میں نے اس کا ہمیشہ خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ میں ہمیشہ حال یا مستقبل قریب میں اس قدر مشغول رہا ہوں کہ مجھے ماضی کے متعلق سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی مگر قدرتی طور پر جس حالت میں مجھے مبتلا کر دیا گیا تھا میں کسی سے اس لہجہ میں بات نہ کر پایا۔ مجھے یہ حق حاصل نہ تھا کہ میں محبت کے جذبات کا اظہار کروں۔ نیک نیتی اور خیر خواہی کا حق مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔ میں نے پھر تقریر سننے کی کوشش کی۔ اب وکیل میری رُوح اور ضمیر کے متعلق کچھ فرما رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"حضرات! اس کا رجحان تو اس طرف ہے مگر وہ کچھ پا نہیں سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا ضمیر ہی نہیں ہے۔ اس میں انسانیت سرے سے غائب ہے اور اخلاقی اصول حسنہ جو انسان کو ممتاز کرتے ہیں اس آدمی کی ان تک رسائی ہی نہیں۔"

"بیشک!" اُس نے کہا، "ہم اس آدمی پہ ضمیر کی تہمت نہیں دھرتے۔ وہ خوبیاں جو وہ کبھی حاصل نہیں کر سکے گا وہ کھو کیسے سکتا ہے؟ مگر جہاں تک اس عدالت کا تعلق ہے ہمیں رواداری کے بالکل منفی نظریہ کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ یہ کام اگرچہ آسان نہیں لیکن عدل و انصاف کے اعلیٰ اصولوں کا تقاضا یہی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب کسی کا دل ایسا کورا ہو جیسا کہ اس شخص کا پایا گیا ہے تو وہ ایک ایسا گڑھا بن جاتا ہے جس میں سارا سماج ڈوب سکتا ہے۔"

پھر اُس نے ماں کے ساتھ میرے رویہ کا ذکر کیا۔ اُس نے ان باتوں کو دہرایا جو وہ بحث کے دوران کہہ چکا تھا۔ مگر اب کی بار میرے جرم کے متعلق اُس کی تقریر بہت لمبی ہو گئی ــــــ اتنی لمبی کہ آخر کار مجھے صرف دوپہر کی گرمی کے سوا اور کسی بات کا احساس نہ رہا۔ کم از کم اس وقت تک جب سرکاری وکیل رُکا اور ایک لمحہ خاموشی کے بعد ایک ہلکی اور بہت اثر پذیر آواز میں کہا:

"حضرات یہی عدالت کل ایک نہایت ہی خوفناک اور شرمناک جرم کا فیصلہ کرنے والی ہے ایک باپ کی موت بیٹے کے ہاتھوں۔"

اس کے مطابق ایسے ظالمانہ جرم کے سامنے تصور چکرانے لگتا ہے۔ اُس نے امید ظاہر کرنے کی جرأت کی کہ

"حضرات: آپ بغیر کسی کمزوری اور نرم دلی کے سزا تجویز کریں گے۔"

وہ لفظوں میں، اس گھناؤنے جرم کو بیان کرنے سے قاصر تھا جس کا میں نے ارتکاب کیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک خوفناک بات ہے لیکن اس کو یہ کہنے میں تامل نہیں محسوس ہوتا کہ میرا جرم اتنا ہی سنگین اور افسوسناک ہے جتنا کہ اس آدمی کا جس نے اپنے باپ کو قتل کیا ہے اس کا کہنا تھا کہ ایک شخص جو اپنی ماں کو اخلاقی طور پر قتل کر سکتا ہے وہ ذلت کی انتہائی پستیوں میں گر جاتا ہے اور اس قماش کے لوگوں کی طرح بن جاتا ہے جن کے ہاتھ انسانیت کے خون سے رنگین ہیں۔ بہر حال پہلی حالت ناگزیر دوسری حالت تک پہنچاتی ہے اور یہ منطق کا تقاضا ہے۔

"مجھے یقین ہے حضرات!" اُس نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا، "کہ آپ میرے خیالات کو گستاخ اور بے ادب نہیں پائیں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ آدمی جو یہاں بنچ پہ بیٹھا ہے اس عدالت کے قتل کا بھی مجرم ہے جو کل فیصلہ سنانے والی ہے۔ لہٰذا اسے کڑی سزا ملنی چاہیے۔"

یہاں سرکاری وکیل نے اپنے چمکتے ہوئے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ آخر اُس نے کہا کہ اس کا فرض ناگوار اور دردناک ہے لیکن لازمی ہے کہ وہ اسے بے خوف و خطر ادا کرے۔ اُس نے کہا کہ مجھے اس سماج پر کوئی حق حاصل نہیں جس کے بنیادی اصولوں کو میں نے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں اس جرم کے بعد انسانیت کے نام پر رحم کی درخواست کروں، جب کہ میں نے خود انسانیت کے سارے اصولوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

"میں آپ سے اس آدمی کے سر کا تقاضا کرتا ہوں اور یہ تقاضا میں آپ سے نہایت صداقت اور ایمان سے کر رہا ہوں۔ وکالت کے میرے طویل تجربے کے دوران کئی مرتبہ میں نے

موت کی سزا کا تقاضا کیا ہے مگر کبھی اس یقین کے ساتھ نہیں جیسا کہ آج کر رہا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ دردناک سزا قانون کے اور احکامِ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ مجھے اس آدمی کے چہرہ پر جو ننگ بشر ہے ہولناک انسانیت سوزی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔"

سرکاری وکیل کے بیٹھنے کے بعد خاموشی رہی۔ میرا سر گرمی اور پریشانی سے چکرا رہا تھا۔ صدر ہلکی سی آواز میں کھانسا اور پھر بہت دھیمی آواز میں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے مزید کچھ کہنا ہے۔ میں کھڑا ہو گیا اور چونکہ میرا جی کچھ کہنے کو چاہ رہا تھا میں نے پہلی بات جو منہ پر آئی کر دی۔ شاید کچھ جھجک کر کہ میری نیت عرب کو قتل کرنے کی نہ تھی۔ صدر نے جواب دیا کہ یہ محض ایک کہنے کی بات ہے جواب تک میری صفائی میں کچھ نہیں مگر وہ بڑی خوشی سے میرے وکیل کو موقع دینے کے لئے تیار ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ ان محرکات کی وضاحت کرے جن کی وجہ سے قتل سرزد ہوا ہے۔

میں نے تیزی سے کہا لفظوں کو کچھ غلط ملط کرتے ہوئے اور یہ سوچتے ہوئے کہ یہ مضحک بات ہے، "کہ قتل کی وجہ سورج کی تپش تھی۔"

عدالت میں قہقہے بلند ہوئے۔ میرے وکیل نے کندھے اچکائے اور پھر فوراً ہی بعد اس نے تقریر شروع کر دی۔ مگر اس نے کہا کہ دیر ہو چکی ہے۔ بحث چند گھنٹوں سے جاری ہے اور اُس نے درخواست کی کہ سماعت دوپہر کے بعد ملتوی ہونی چاہئے۔ عدالت نے اُس کی بات مان لی۔

دوپہر کے بعد بڑے پنکھے ہال کی آلودہ ہوا کو صاف کر رہے تھے اور جیوری کے اراکین کے ہاتھ کے پنکھے بھی ایک متناسب ترنم کے ساتھ ہل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے وکیل کی تقریر کبھی ختم ہی نہ ہو گی۔ میں اس پر کچھ دھیان نہیں دے رہا تھا مگر

ایک لمحہ میں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سنا:

"یہ صحیح ہے کہ اُس نے قتل کیا ہے۔"

پھر اُس نے اپنے انداز میں تقریر جاری رکھی۔ جب میں نے کئی مرتبہ "میں" کا لفظ سنا تو میں سمجھا کہ وہ میری بات کر رہا ہے۔ میں بہت حیران ہوا۔ میں ایک سپاہی کی طرف جھکا اور اس سے پوچھا کہ یہ کیوں؟ اُس نے مجھ سے کہا خاموش رہو اور پھر ایک لمحے کے بعد کہا:

"سب وکیل یونہی کیا کرتے ہیں۔"

مجھے محسوس ہوا کہ مقدمہ از سرِ نو شروع ہو رہا ہے۔ میری حیثیت تو محض صفر کی تھی لیکن ایک لحاظ سے میری جگہ کسی اور نے لے رکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں پہلے ہی عدالت کے کمرہ سے بہت دُور کسی اور دنیا میں پہنچ چکا ہوں۔ بہرحال مجھے میرا وکیل مضحک معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بہت تیزی سے تقریر کر رہا تھا اور پھر اس نے بھی وہ قصہ چھیڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ سرکاری وکیل کی نسبت وہ بہت کم قابلیت کا مالک ہے۔

"میں نے بھی!" اُس نے کہا "اس آدمی کے ضمیر کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن استغاثہ کے قابل نمائندے کے کہنے کے خلاف میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس تلاش سے کچھ حاصل ہوا ہے اور میں نے یہ کھلی کتاب پڑھ لی ہے۔"

اُس نے وہاں یہ پڑھا کہ میں ایک دیانتدار آدمی ہوں۔ ایک باقاعدہ کام کرنے والا انتھک، اپنی فرم کا وفادار، دوسرے کے درد میں شریک ہونے والا۔ اُس کے لئے میں ایک مثالی بیٹا تھا جس نے اپنی ماں کی اپنی حیثیت کے مطابق خاصے عرصے تک خدمت کی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ آرام جو اس کے ذرائع معاش اس کی ماں کے لئے مہیا نہیں

کر سکتے تھے وہ بوڑھوں کی رہائش گاہ میں میسر آ سکیں گے۔" اُس نے مزید کہا:

"میں حیران ہوں حضرات کہ بوڑھوں کی رہائش گاہ کے متعلق اس قدر بات کا بتنگڑ کیوں بنایا گیا ہے کیونکہ آخر کار ایسے اداروں کی عظمت اور فوائد کے ثبوت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود حکومت ان کی مالی امداد کرتی ہے۔"

صرف اُس نے جنازے کی بات نہیں چھیڑی اور میں نے محسوس کیا کہ تحریر میں کسر اسی بات کی رہ گئی ہے۔ لیکن ان سب لمبی بحثوں کے باعث ان ختم نہ ہونے والے اوقات کی وجہ سے جن کے دوران میرے ضمیر کے متعلق تقریریں ہوتی رہیں، مجھے احساس ہوا کہ سب فضا بے رنگ، موہوم اور دھندلائی ہوتی ہے اور میرا سر چکرا رہا ہے اور صاف طور پر کچھ پتے نہیں پڑتا۔ صرف ایک واقعہ نمایاں ہے۔ میرا وکیل ابھی تک تقریر کر ہی رہا تھا کہ میں نے گلی سے آئس کریم بیچنے والے کی ترمچی کی آواز سنی۔ ایک باریک اور تیز آواز جو وکیل کے لفظوں کے بہاؤ کو چیر کر مجھ تک آ رہی تھی۔ پھر میرے ذہن میں یادوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔

آخر میں مجھے یہ یاد ہے کہ اپنے وکیل کی تقریر کے دوران میں عدالت اور ججوں کی نشست گاہوں کو پھلانگتا ہوا گلی کوچوں میں پہنچ گیا۔ آئس کریم بیچنے والے کا بگل میرے کانوں میں بج رہا تھا۔ میں اس زندگی کی یادوں تلے دب گیا جس کا اب مجھ سے کچھ تعلق نہ رہا تھا مگر جہاں میں نے کبھی بہت سی چھوٹی چھوٹی لازوال خوشیاں پائی تھیں —— گرمی کی خوشبوئیں، وہ گلیاں جن سے مجھے اُنس تھا۔ شام کا آسمان —— ماری کا لباس اور اُس کی وہ ہنسی۔ یہ سب چیزیں اگرچہ میرے لئے بیکار ہو چکی تھیں۔ مگر ان کی یاد مجھ پر چھا رہی تھی۔ یہ یادیں میری زندگی کا سرمایہ تھیں۔ یہاں عدالت میں جو کچھ ہو رہا تھا، بے حاصل تھا۔ مجھے متلی کی کیفیت

محسوس ہوئی اور مجھے صرف ایک ہی خیال آ رہا تھا کہ اسے کیونکر رد کروں۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی کوٹھڑی میں لوٹ جاؤں اور نیند —— ابھی یہ کیفیت ختم نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے وکیل کو آخری جملے کہتے سُنا:

"کیا جیوری ایک ایماندار کام کرنے والے کو جو ایک لمحہ کے لئے گمراہ ہو گیا تھا، موت کے منہ میں دھکیل دے گی؟"

اُس نے ان حالات کا تذکرہ کیا جو جُرم کی تخفیف کرتے ہیں اور جو وہ پہلے ہی بیان کر چکا تھا اور کہا کہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مجرم پہلے ہی اپنے جرم پر پریشان ہے اور یہ سزا اُس کے لئے بہت کافی ہے۔

عدالت ملتوی ہوئی اور وکیل تھک کر بیٹھ گیا۔ مگر اس کے کچھ ساتھی اس کی طرف آئے اور اُس سے ہاتھ ملائے۔ میں نے سُنا:

"کمال کیا ہے یار۔ بہت خوب بحث کی۔"

ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا:

"کیا تم بھی اتفاق کرتے ہو؟"

میں نے بھی کہہ دیا کہ تقریر خوب تھی۔ مگر میں نے خلوص سے یہ تعریف نہ کی کیونکہ میں بہت تھکا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں باہر دن ڈھل رہا تھا اور گرمی کم ہو رہی تھی۔ گلی کوچوں سے آوازوں کے کچھ مبہم پہلوؤں سے مجھے شام کی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ وہاں ہم سب منتظر تھے مگر جس چیز کا انتظار مجھے تھا اس سے میرے علاوہ کسی اور کو تعلق نہ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر عدالت کے کمرہ پر نگاہ ڈالی۔ سب کچھ بالکل پہلے دن کی طرح تھا۔ میں نے اخبار

زمین کو بھورے رنگ کی واسکٹ پہنے دیکھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ عورت جو شین کی طرح ساکت تھی اب بھی وہیں ہے۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ ساری کارروائی کے دوران میں نے ایک بار بھی ماری کو نظر تک اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں نے اس کو فراموش نہیں کیا تھا مگر میں اس قدر مصروف تھا۔ میں نے اب اسے سیلسٹ اور ریموں کے درمیان بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے ایک ہلکا سا اشارہ کیا جیسے کہ وہ کہہ رہی ہے:

"آخر کار ——!"

اور میں نے اس کا چہرہ دیکھا، یک گونہ پریشان مگر مسکراتا ہوا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے دل پر تالا پڑ چکا ہے اور میں اس کی مسکراہٹ کا جواب تک نہیں دے سکتا۔

عدالت کی کارروائی پھر شروع ہوئی۔ کسی نے جلدی جلدی جیوری کے سامنے سوالات کی فہرست پڑھی۔ میرے کان میں کچھ جملے پڑے:

"موت کا قصوروار —— تخفیف کرنے والے حالات۔"

جیوری باہر چلی گئی۔ مجھے ایک چھوٹے سے کمرہ میں لے جایا گیا جہاں میں پہلے بھی انتظار کر چکا تھا۔ وہاں میرا وکیل پہنچا۔ وہ بہت باتیں کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے اعتماد سے باتیں کرتا رہا اور اس قدر خوشگوار طریقے سے پیش آیا کہ کبھی پہلے نہ آیا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ سب خیریت رہے گی اور میرا چھٹکارا چند سال کی قید بامشقت سے ہو جائے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ سزا منسوخ کرانے کی کیا گنجائش ہے۔ اس نے کہا کہ کچھ نہیں اس نے قانون کا کوئی نکتہ نہیں اٹھایا تھا کیونکہ اس سے امکان تھا کہ جیوری بے جا متخالف نہ ہو جائے اور عدالت کے فیصلہ کی تنسیخ ممکن نہیں سوائے ٹیکنیکی وجوہ کے۔ اس نے مجھے بتایا کہ خواہ مخواہ بے مقصد تنسیخ کی درخواست نہیں دینا چاہئے۔ بات تو ظاہر تھی اور میں

نے اس سے اتفاق بھی کیا۔ معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد یہ سب کچھ ایک قدرتی امر معلوم ہوتا تھا۔ تنسیخ کی صورت میں خواہ مخواہ فضول کاغذات کا ڈھیر لگ جائے گا۔ بہرصورت میرے وکیل نے کہا کہ وہ عام طریقے سے میری اپیل کر سکتا ہے۔ لیکن اسے یقین تھا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہو گا۔

ہم نے بہت انتظار کیا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی پون گھنٹہ۔ پھر ایک گھنٹی بجی۔ میرا وکیل مجھ سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا:

"جیوری کا صدر جیوری کی سفارش پیش کرے گا۔ ہم فیصلہ کے اعلان سے پہلے عدالت میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

کچھ دروازوں کے کھلنے کی آواز آئی۔ لوگوں کی سیڑھیوں پر بھاگنے کی آواز آئی یہ نہ پتہ چلا کہ سیڑھیاں قریب تھیں یا دور۔ پھر مجھے ایک گھٹی سی آواز عدالت میں کچھ پڑھتے ہوئے سنائی دی۔ جب گھنٹی دوبارہ بجی۔ عدالت کا کمرہ کھلا۔ کمرے کی خاموشی مجھے گھیرے ہوئے تھی۔ یہ خاص انوکھی کیفیت مجھ پر اس وقت طاری ہوئی جب میں نے کم عمر اخبار نویس کو پہلی مرتبہ مجھ سے نظریں بچاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے ماری کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا مجھے فرصت ہی کہاں تھی۔ کیونکہ صدر پہلے ہی ایک عجیب انداز سے کچھ اس طرح کہہ رہا تھا

"میرا سر فرانس کے عوام کے نام پر چوراہے پر کاٹا جائے گا۔"

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ احساسات جو لوگوں کے دل میں بستے ہیں ان کے چہروں پہ پڑھ سکتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ سپاہی نے بھی میرے ساتھ بڑی شفقت برتی۔ وکیل نے میری کلائی پر ہاتھ رکھا۔ پھر میرے دماغ میں کوئی خیال نہ آیا۔ میرے کان میں یہ پڑا کہ صدر نے مجھ سے پوچھا ہے کہ مجھے کچھ اور

تو نہیں کہنا ۔ میں نے ذرا سوچا اور پھر کہا :

"نہیں —— !"

اس کے بعد پولیس مجھے وہاں سے لے گئی ۔

۱۱

میں نے ابھی تیسری مرتبہ جیل کے پادری کو ملنے سے انکار کیا ہے ۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے ۔ میرا کچھ کہنے کو جی ہی نہیں چاہتا ۔ لیکن بہر حال تھوڑی دیر بعد مجھے اُس سے ملنا ہی ہوگا اس وقت مجھے جس بات میں دلچسپی ہے وہ صرف یہ ہے کہ جلاد کی مشین سے کیوں کر چھٹکارا پایا جائے ۔ کیونکر قضا سے گریز کی راہ تلاش کی جائے ۔ میری کوٹھڑی بدل دی گئی ہے اس جگہ جہاں میں اب معرض التوا میں پڑا ہوا ہوں میں آسمان کو دیکھ سکتا ہوں ۔ اس کے سوا دیکھنے کو اور دھرا ہی کیا ہے ۔ میرے دن اسے دیکھتے دیکھتے کٹ جاتے ہیں ۔ اس کے بدلتے ہوئے رنگوں سے مجھے دن اور رات کا پتہ ملتا ہے ۔ لیٹے لیٹے میں سر کے پیچھے ہاتھ رکھ لیتا ہوں اور اسے دیکھتا ہوں اور انتظار کرتا رہتا ہوں معلوم نہیں میں نے کتنی مرتبہ اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا کوئی ایسی مثال بھی ہے کہ کوئی ملزم جسے موت کی سزا سنا دی گئی ہو وہ قتل سے پہلے سپاہیوں کا حلقہ توڑ کر بھاگ نکلا ہو ۔ پھر میں اپنے آپ پر ملامت کرتا ہوں کہ میں نے پہلے موت کے واقعات کو کیوں زیادہ توجہ سے نہیں پڑھا ۔ آدمی کو ہمیشہ ایسے معاملات میں دلچسپی لینا چاہئے ۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے اور لوگوں کی طرح میں نے بھی اخباروں میں مقدمہ کی روئیداد پڑھی تھی

یقیناً خاص طور پر تفصیل سے بیان بھی چھپے تھے، اگر یہاں تحقیق و تجسس کا شوق کسے تھا کہ انہیں غور سے پڑھتا۔ شاید ان میں فرار کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جاتا۔ مجھے خوب یاد پڑتا ہے کہ میں نے سن رکھا تھا کہ ایک مرتبہ تو مشین کے پہیے رُک گئے تھے۔ اگرچہ ایک ہی مرتبہ واقعات کی بے رحم چال میں خوش قسمتی نے ایک خوشگوار کردار ادا کیا تھا ــ صرف ایک مرتبہ! میرا خیال ہے کہ ایک طرح سے یہ واحد واقعہ ہی میری تسلی کے لئے کافی تھا۔ باقی کمی میرے جذبات پوری کر دیتے۔ میں جانتا ہوں کہ کم از کم ایک وقوعے میں تو ملزم پکڑا جائے گا اس زبردست پیش بندی میں خطرہ بھی ہے اور قسمت آزمائی کا موقع بھی ــــــ اگر صرف ایک مرتبہ بھی کامیابی نصیب ہو جائے تو سب کچھ بدل جائے گا۔ صرف ایک مرتبہ۔ ایک طرح میں نے سوچا کہ یہ میرے لئے بس ہے باقی کام میرا دل کرے گا۔

اخبارات اکثر ایک قرض کا ذکر کیا کرتے ہیں جو ان کے کہنے کے مطابق ہمیں سماج کو ادا کرنا ہے۔ مگر اس بات سے قوت متخیلہ کی تسکین نہیں ہوتی۔ اہم مسئلہ تو فرار کے امکانات کا تھا۔ سنگ دل رسوم کے باہر ایک جست۔ آزادی کی طرف حماقت کی ایک سرپٹ دوڑ۔ جس سے سب امیدیں وابستہ تھیں، جواری کی آخری چال۔ قدرتی طور پر کوچے کی نکڑ میں امید عین فرار کے دوران گولیوں کی ایک باڑ سے زخمی ہو کر گر پڑی۔ غور و خوض کے بعد فرار کا خیال بھی محض ایک تکلف اور کوشش بیہودہ نظر آنے لگا۔

اپنی نیک خواہی کے باوجود میں اس ایقان کی گستاخی قبول نہ کر سکا کیونکہ آخر کار میرا یہ فیصلہ سرتا سر غیر متناسب تھا اور اس کی بنا واقعات کی وہ کڑی تھی جو فیصلے کے بعد ظہور میں آئی۔ یہ واقعہ کہ فیصلہ شام کے پانچ بجے کی بجائے آٹھ بجے سنایا گیا۔ یہ امر کہ فیصلہ شاید اس سے مختلف ہو سکتا تھا۔ یہ بات کہ یہ فیصلہ جیوری کے علمی قسم کے لوگوں نے کیا تھا اور یہ امر کہ یہ فیصلہ ایسے غیر واضح نظریے کے ماتحت کیا گیا تھا۔ یعنی فرانس کے عوام کے نام پر (یا چین یا المانی کیوں نہیں؟) یہ سب واقعات میرے خیال میں عدالت کے فیصلہ کی سنجیدگی پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ بہر حال میں یہ حقیقت قبول کرنے پر مجبور تھا کہ فیصلہ ہوتے ہی اس کے نتائج اتنے ہی ٹھوس اور سنجیدہ ہو گئے ہیں جتنی کہ وہ دیوار جس کے ساتھ میں کمر ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا۔

ایسے میں مجھے ایک کہانی یاد آئی جو امی ابا کے متعلق سنایا کرتی تھیں۔ مجھے ابا یاد نہیں ہیں ــ ان کے متعلق سوائے ان باتوں کے جو امی بتایا کرتی تھیں۔ مجھے کچھ اور علم نہ تھا۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک دن وہ ایک قاتل کی پھانسی دیکھنے گئے۔ وہاں جانے کے خیال سے ہی ان کی طبیعت ناساز ہونے لگی۔ بہر حال وہ وہاں گئے اور واپس آ کر سارا دن قے کرتے رہے۔ یہ سُن کر اس وقت مجھے ابا سے نفرت سی ہو گئی مگر اب مجھے سمجھ آئی کہ یہ ایک طبعی بات تھی اور سمجھ بھی کیونکر نہ آتی کیونکہ آدمی کے لئے پھانسی سے زیادہ اور کون سی چیز دلچسپ ہو سکتی ہے۔ صحیح معنوں میں یہی ایک چیز ہے جسے دیکھنے میں آدمی کو دلچسپی ہونی چاہئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میرا کبھی جیل سے چھٹکارا ہوا تو میں سب پھانسیاں دیکھنے جایا کروں گا۔ اگرچہ اس امکان کا سوچنا ہی ایک غلطی تھی، اگر اس خیال سے کہ میں سپاہیوں کے دُہرے حلقے کو پھاند کر ایک صبح کسی نہ کسی طرح پھانسی دیکھنے پہنچ گیا ہوں اور پھر اس تماشے کے بعد گھر لوٹ کر میں نے بھی قے کی ہے۔ میرے دل میں خوشی کی ایک زہر آلود موج دوڑ گئی۔ مگر یہ معقول بات نہ تھی۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں ایسے خیالات کی رو میں بہہ گیا۔ ایک لمحہ بعد مجھے اس غضب کی سردی لگی کہ میں اپنے کمبل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرے دانت بج

رہے تھے اور میں بے بس ہو رہا تھا۔

مگر قدرتی بات ہے کہ انسان ہمیشہ تو معقول باتیں نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر کئی مرتبہ میں نے قانون کے نئے منصوبے تیار کئے۔ میں نے سزاؤں میں ترمیم تجویز کی۔ میں نے سوچا کہ مجرم کو ایک موقع دینا نہایت ضروری ہے۔ ہزاروں میں سے ایک کا شاید اس سے بھلا ہو جائے۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ کوئی ایسی کیمیا تلاش کی جائے جس کے پیتے ہی مریض دس میں کم از کم نو مرتبہ تو زندگی سے نجات حاصل کر سکے (مجھے "مریض" کا لفظ سوجھا) شرط یہ تھی کہ آدمی مریض ہو لیکن پھر سوچنے اور سنجیدگی سے معاملہ پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ سر کاٹنے والے چھرے میں یہ بڑا نقص ہے کہ اس سے بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں، بالکل کوئی صورت نہیں۔

مختصر یہ کہ چھرے کا ایک وار مریض کی موت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ یہ ایک کلاسیکی مثال تھی۔ یہ جوڑ خوب تھا۔ بالکل متفقہ فیصلہ جس سے مفر کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ ہو جائے اور ایک آدھ وار خطا ہو جائے تو سلسلہ پھر سے شروع ہو جائے گا۔ مگر جھنجھلاہٹ اس بات سے ہوتی ہے کہ جسے موت کا حکم دیا گیا ہے اُس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ اس امید پر جئے کہ اس کی جان لیوا مشین اپنا کام صحیح طور پر انجام دے گی۔ میں نے کہا کہ اس نظام میں تو یہ بڑا نقص ہے۔ اس طرح سے یہ بات سچ تھی مگر ایک اور طرح سے میں یہ ماننے پر بھی مجبور تھا کہ ہر اچھے نظام کا یہی نوراز ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ جسے موت کا حکم ملا ہے وہ مجبور ہے کہ اخلاقی طور پر اپنے جلاد سے تعاون کرے۔ اس کا بھلا اس میں ہے کہ دونوں بغیر کسی رکاوٹ کے ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔

میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ ابھی تک ان معاملات پر جو میں نے سوچ بچار کیا ہے وہ کچھ صحیح نہیں ہے۔ ایک عرصہ سے میں نے یہ سمجھ رکھا تھا —— معلوم نہیں کیوں گلوٹین (جلاد کی مشین) پر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھ کر ایک بلند چبوترے پر جانا ہوتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ ۱۷۸۹ء کا انقلاب تھا۔ میرا مطلب ہے کہ س کی وجہ وہ سب کچھ تھا جو میں نے اس موضوع پر پڑھ یا دیکھ رکھا تھا۔ لیکن ایک صبح میں نے اخباروں میں ایک تصویر دیکھی جو ایک مشہور و معروف مجرم کی پھانسی کے سلسلے میں چھپی تھی۔ در حقیقت مشین سیدھی سادی زمین پر پڑی ہوئی تھی اور میرے اندازے سے وہ کہیں زیادہ مختصر نکلی۔

وہ خاصی مضحک تھی اور میں حیران ہوں کہ میں اس سے پہلے یہ کیونکر نہ سمجھ سکا۔ مشین کی ساخت نہایت نفیس تھی اور میں اس کی جزئیات کا ریگری دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ وہ بہت ںدہ اور چمکیلی تھی۔ آدمی جس چیز کو نہ جانتا ہو اس کے متعلق ہمیشہ اس کے خیالات مبالغہ آمیز ہو جاتے ہیں۔ برعکس اس کے اب مجھے ماننا پڑا کہ بات تو سیدھی سادی تھی۔ مشین اس سطح پر تھی جس پر وہ لوگ جنہیں اس کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اس کی طرف آدمی ایسے ہی قدم بڑھاتا ہے جیسے کہ کسی پاس سے ملنے جا رہا ہو۔ یہ خیال بھی پریشان کن تھا بلند چبوترے پر چڑھنا، آسمان کی طرف پرواز کرنا یعنی ایک طرح سے اس دنیا کو نیچے چھوڑ جانا۔ یہ بات تو تصور کو بھلی لگتی تھی مگر مشین نے ان خیالات کا تانا بانا توڑ دیا۔ اسے تو تمیز سے جان لینا ہے۔ تھوڑی سی شرمندگی اور بہت سے ضابطے کے ساتھ۔

دو اور چیزیں تھیں جن کے متعلق میں تمام وقت سوچتا رہا —— طلوع صبح اور اپنی اپیل —— میں اپنے آپ کے ساتھ اُلجھتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ ان کے متعلق کچھ

اور نہ سوچوں۔ مگر میری سوچنے کی طاقت تیز تر ہوتی گئی۔ میں آسمان کو تکتا اور اپنے آپ کو زبردستی اس میں اور زیادہ دلچسپی لینے پر آمادہ کرتا۔ جب آسمان سبز رنگ ہونا شروع ہو جاتا تو میں سمجھتا کہ شام ڈھل گئی ہے۔ میں نے پھر کوشش کی کہ میرے خیالات کا رُخ بدل جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے دل کی دھڑکن کو سننا شروع کیا۔ میرے ذہن میں کبھی یہ نہ آسکتا تھا کہ یہ ہلکی سی آواز جو ایک عرصہ سے میرا ساتھ دے رہی تھی کبھی بند ہو جائے گی۔ مگر یہ میرے تخیل کی کم مائیگی تھی۔ بہرحال میں نے کوشش کی کہ ایک ایسے لمحہ کا تصور کروں جب میرے دل کی دھڑکن کی صدائے بازگشت میرے دماغ تک نہ پہنچ سکے گی۔ مگر یہ کوشش بیہودہ تھی۔ طلوع آفتاب اور میری اپیل وہ تو وہیں کے وہیں رہے۔ میں آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ خیالات کے فطری رُخ کو بدلنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔

وہ ہمیشہ پو پھٹتے ہی مجرم کو قتل ۔۔ کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ یہ مجھے معلوم تھا۔ چنانچہ میری راتیں پو پھٹنے کے انتظار میں کٹتیں۔ مجھے کبھی یہ بھلا معلوم نہ ہوا کہ مجھے کوئی بے خبری میں اچانک آلے۔ جب کوئی واقعہ ہونے والا ہو تو میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں دن کو ہلکا سا اونگھ لیتا اور رات بھر نہ سوتا۔ میں بے صبری سے انتظار کرتا رہتا کہ اوپر والے "تاریک گنبد" سے پو پھٹنے کا کوئی اشارہ ملے۔

شک و شبہ کی وہ گھڑی بڑی سخت گزرتی جب مجھے خیال آتا کہ معمولاً وہ اسی وقت آیا کرتے ہیں۔ میں آدھی رات گئے انتظار کی گھڑیاں گنتا رہتا۔ میرے کان میں کبھی اس قدر باریک اور ہلکی آوازیں نہ پڑی تھیں۔ بہرحال میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طرح سے میں خوش قسمت تھا کیونکہ اس تمام عرصہ کے دوران میں نے کبھی کسی کے پاؤں کی

آہٹ نہ سُنی۔ امی اکثر کہا کرتی تھیں کہ انسان کبھی کلی طور پر ناخوش نہیں ہوتا۔ اس بات کا مجھے جیل میں تجربہ ہوا جب آسمان پر رنگ نکھرتا اور جب ایک نیا دن میری کوٹھڑی میں طلوع ہوتا۔ یوں بھی تو ہو سکتا تھا کہ مجھے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی اور میرا دل خوف کے مارے دھڑکنے لگتا۔ ذرا سی ہلکی آہٹ پر میں دروازے کی طرف لپکتا۔ پٹ پر کان لگا کر پاگلوں کی طرح گرش برآواز رہتا حتیٰ کہ مجھے اپنا سانس بھی سنائی دینے لگتا۔ مجھے یہ خوف رہتا کہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ لیکن آخر مجھے ایک ایسی آواز سنائی دیتی جیسے کتے کے حلق میں سانس رُک گیا ہو۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دینے لگی اور میں یہ سمجھتا کہ مجھے زندگی کا ایک اور دن مل گیا ہے۔

پھر دن بھر میری اپیل کا دھندا رہتا۔ میں نے اس کے سبھی پہلوؤں پر غور کیا۔ میں نے حساب کیا کہ آخر اس کا نتیجہ کیا ہے اور میرے سارے سوچ بچار کا لب لباب کیا ہے۔ میں ہمیشہ "تاریک" سے "تاریک" پہلو کو لیتا۔ میری اپیل رد ہو گئی ہے۔

"خوب تو اب مجھے مرنا ہے۔"

ظاہر ہے سب لوگوں سے ذرا پہلے۔ یہ تو واضح ہی تھا مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ زندگی اس قابل نہیں کہ محض جینے کے لئے اتنی سختیاں برداشت کی جائیں۔ درحقیقت مجھے معلوم تھا کہ تیس برس کی عمر میں یا ستر برس کی عمر میں مرنا دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے کیونکہ ہر دو حالتوں میں قدرتی طور پر دوسرے مرد اور دوسری عورتیں زندہ رہیں گی اور دنیا کا یہ سلسلہ ہزاروں برس جاری رہے گا۔ مختصر یہ کہ کوئی بات صاف نہ تھی۔ بہرا وقت سوال تو میری موت کا تھا ۔۔۔ کہ یہ اب آئے گی یا بیس برس بعد ۔۔۔ اس لمحہ میرے استدلال میں جو بات ذرا کھلتی تھی وہ یہ تھی کہ آنے والے بیس برسوں کا خیال مجھ میں

اپنی ذات کے ساتھ ایک زبردست لگاؤ کا احساس پیدا کر رہا تھا مگر میں نے اس خیال کا گلا گھونٹ دیا۔ یہ تصوّر کرتے ہوئے کہ اگر موت تک جانا ضروری ہی ٹھہرا تو میں بری ہی کیا معلوم میرے خیالات کا کیا ڈھنگ ہوگا۔ جس وقت آدمی جان دیتا ہے وہ کیسے اور کیونکر مرتا ہے یہ لایعنی سوال بن جاتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے۔ پھر مشکل یہ تھی کہ اس استدلال میں پھر جن معنوں کی نمائندگی کرتا تھا اسے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔ پھر مجھے اپنی اپیل کی نامنظوری کا امکان قبول کر لینا چاہیے۔

اس لمحہ صرف اس لمحہ ——— یوں کہئے کہ مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں اپنے آپ کو دوسرا مفروضہ قائم کرنے کی اجازت دوں ——— یعنی سزائے موت کو سزائے قید میں بدل جانے کا حکم مل گیا ہے۔ فوراً خون کی ایک تند و تیز لہر میرے سارے بدن میں سرپٹ دوڑ گئی اور میری آنکھوں سے ایک ناقابل بیان خوشی کی سنسنی سے آنسو ٹپکنے لگے

..ں سے میری

کوفت کچھ کم ہوئی۔ مگر واجب تھا کہ میں خوشی کے اس طوفان کو دلائل سے تھامنے کی کوشش کروں۔ اس امکان پر غور کرتے ہوئے لازم تھا کہ میں اپنے حواس کو قائم رکھوں تاکہ پہلے امکان سے جو ڈھارس بندھی تھی اس کا بھی اعتبار نہ اٹھ جائے۔ جب مجھے اس میں کامیابی ہوئی تو مجھے گھنٹہ بھر سکون نصیب ہوا۔

کچھ ایسا ہی لمحہ تھا جب میں نے ایک اور مرتبہ پادری کو ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

میں بیٹھا ہوا تھا اور ایک قسم کی ہلکی سی سنہری روشنی سے جو افق پر پھیل رہی تھی اس شام کی آمد کا اندازہ کر رہا تھا۔ میں اپنی اپیل رد کرنے والا تھا۔ مجھے خون کی لہروں کا احساس

ہو رہا تھا، جو میرے اندر باقاعدہ موجزن تھیں۔ یعنی مجھے پادری کو ملنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بہت عرصہ کے بعد مجھے ماری کا خیال آیا۔ ایک مدت سے اُس نے مجھے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آج کی شام میں نے سوچا اور اپنے آپ کو کہا کہ شاید وہ ایک ایسے آدمی کی جسے موت کا حکم مل چکا ہے، داشتہ بننے سے اُکتا چکی ہے۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ شاید وہ بیمار ہے یا اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ آخر یہ کوئی انہونی بات تو نہ تھی۔ اور اب مجھے پتہ بھی کیسے چلتا۔ دو جسموں کے علاوہ جو اب علیحدہ ہو چکے تھے ہمارے درمیان کوئی اور رشتہ نہ تھا جو ہمیں ایک دوسرے کی یاد دلاتا۔ بالفرض وہ مر گئی ہے تو اس کی یاد کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ مجھے کسی مُردہ لڑکی سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ طبعی بات تھی۔ مجھے خوب پتہ تھا کہ میری موت کے بعد بھی لوگ مجھے بھول جائیں گے۔ ان کا مجھ سے کوئی واسطہ نہ رہے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوچ غلط تھی۔ کوئی خیال ایسا نہیں ہے کہ انسان وقت کے ساتھ اس کا عادی نہ ہو جائے۔ میرے خیالات اس نکتہ پر پہنچے تھے کہ پادری اندر داخل ہوا بغیر اعلان کئے۔

جب میں نے اُسے دیکھا تو مجھے کپکپی سی ہوئی۔ وہ اسے بھانپ گیا اور مجھ سے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے اُس سے کہا:

"خوف کبھی نہ کبھی آتا ہی ہے۔"

اُس نے جواب دیا کہ وہ دوستانہ طور پر آیا ہے اور اس کی آمد کا میری اپیل سے کوئی واسطہ نہیں اور اس کے متعلق اُسے کچھ علم بھی نہیں۔ وہ میری چارپائی پر بیٹھ گیا اور مجھے دعوت دی کہ میں اس کے قریب بیٹھوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھر بھی بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہا۔

وہ ایک لمحہ یوں بیٹھا رہا۔ بازو گھٹنوں پر ٹیکے۔ سر جھکائے وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ نازک تھے مگر رگیں موٹی موٹی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے دو پھر تیلے جانوروں کا خیال آیا۔ وہ دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر آرام سے رگڑتا رہا۔ پھر وہ دم بھر رُکا۔ سر بدستور جھکائے ہوئے۔ اتنی دیر تک کہ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ وہاں موجود ہی نہیں۔ لیکن اُس نے معاً سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا:

"آپ نے مجھ سے ملنے سے انکار کیوں کیا؟" اُس نے کہا۔

میں نے جواب دیا:

"میں خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔"

وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا مجھے اس بات پر پورا یقین ہے اور میں نے جواب دیا:

"میں نے کبھی اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ مجھے یہ سوال غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔"

وہ پھر پیچھے ہٹ گیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی۔ اس کے ہاتھ اس کی رانوں پر تھے۔ کچھ اس انداز سے جیسے کہ وہ مجھ سے بات نہیں کر رہا۔ اُس نے کہا:

"آدمی کئی مرتبہ سوچتا ہے کہ اُسے پورا یقین ہے لیکن درحقیقت یوں نہیں ہوتا۔"

میں نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور مجھ سے سوال کیا:

"آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ یہ ممکن ہے ــــ بہر حال مجھے شاید اس بات کا پورا یقین نہیں کہ مجھے کس چیز میں دلچسپی ہے مگر جس چیز میں مجھے دلچسپی نہیں ہے اس کا مجھے پورا یقین ہے اور سچ یہ ہے کہ وہ بات جس کا وہ ذکر کر رہا تھا اس میں مجھے ہرگز کوئی دلچسپی

نہ تھی۔

وہ دوسری طرف دیکھنے لگا اور پہلو بدلے بغیر مجھ سے کہا کہ کیا میں مایوسی کی وجہ سے تو یوں نہیں کہہ رہا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نا اُمید نہیں ہوں۔ مجھے صرف خوف آرہا ہے اور یہ ایک طبعی بات ہے۔

"اللہ آپ کی مدد کرے گا" اُس نے کہا۔ "آپ کی حالت میں جتنے بھی میں نے لوگ دیکھے ہیں وہ سب اپنی مشکل کے وقت اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

میں نے مانا کہ یہ اُن لوگوں کا حق ہے اور یوں بھی اُن کے پاس وقت بہت ہے مگر جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے کسی کی امداد کی خواہش نہ تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس وقت کہاں کہ ایسی باتوں میں دلچسپی لیتا جو مجھے بالکل دلچسپ معلوم نہ ہوتی تھیں۔

اس لمحہ اُس نے بے چینی اور پریشانی کے عالم میں ہاتھ جھاڑے۔ مگر وہ سنبھل گیا اور اپنے لباس کی سلوٹیں درست کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے مجھے "میرے دوست" کہہ کر خطاب کرنے لگا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے موت کا حکم مل چکا تھا۔ اُس کی رائے میں ہم سب کو موت کا حکم مل چکا ہے۔ مگر میں نے قطع کلام کرتے ہوئے اُس سے کہا:

"یہ ایک ہی بات تو نہیں ہے۔ بہر حال اس سے کسی کی اشک شوئی نہیں ہوتی۔"

"شاید!" اُس نے کہا۔ "مگر سب کو ایک دن مرنا ہے۔ آج نہیں تو کل۔ پھر یہی سوال اٹھتا ہے کہ اس بھیانک وقت کا کیونکر سامنا کیا جائے؟"

میں نے جواب دیا:

"بالکل ویسے ہی جیسا کہ میں اب کر رہا ہوں۔"

اس پر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ یہ چال میں خوب پہچانتا تھا۔ میں ایمونیول اور سلیسٹ پر یہی چالبازی کر کے اکثر اپنا دل بہلایا کرتا تھا اور عام طور پر وہ آنکھیں موڑ لیا کرتے تھے۔ پادری یہ کھیل خوب جانتا تھا۔ میں فوراً بھانپ گیا۔ اُس کی نظر کانپ نہیں رہی تھی اور نہ ہی اُس کی آواز میں لرزش تھی جب کہ اُس نے مجھ سے کہا:

"کیا آپ کو کوئی امید نہیں ہے؟ کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ موت کے بعد آپ کلی طور پر مر جائیں گے اور کچھ باقی نہیں رہے گا؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔

تب اُس نے آنکھیں جھکا لیں اور پھر سے بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا کہ اُسے مجھ سے واقعی ہمدردی ہے۔ اگر آدمی کا زندگی کے متعلق نظریہ وہی ہو جو میرا ہے تو جینا وبال ہو جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اُس نے مجھے بور کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے پیٹھ موڑ لی اور روشن دان کے نیچے چل دیا۔ میں کندھے دیوار کے ساتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ میں اُس کی طرف توجہ دینے کی کوشش ہی نہیں کر رہا تھا مگر میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے پھر سوال کر رہا ہے۔ وہ ایک متفکر اور متین آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ پریشان ہے اور بہتر ہے کہ میں اُس کی بات سن ہی لوں۔

اُس نے مجھے بڑے اعتماد سے کہا کہ اُسے یقین ہے کہ میری اپیل منظور ہو جائے گی۔ مگر میں نے خواہ خواہ گناہ کا ایک بوجھ اپنے اُوپر لاد لیا ہے اور اس سے مجھے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے مطابق انسان کا انصاف کچھ بھی نہیں اور خدا کا انصاف سب کچھ ہے۔ میں نے کہا:

"مجھے انسانوں کی عدالت نے موت کا حکم سنایا ہے۔"

اُس نے جواب دیا کہ اس سے بہرحال میرا گناہ تو نہیں دُھل جاتا۔

میں نے اُس سے کہا:

"مجھے معلوم نہیں کہ میرا گناہ کیا ہے۔ مجھے تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ میرا جُرم کیا ہے۔ میں نے جُرم کیا ہے۔ میں اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اس سے زیادہ تو کوئی مجھ سے تقاضا نہیں کر سکتا۔"

اس لمحہ وہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے سوچا کہ اس تنگ کوٹھڑی میں اگر وہ حرکت کرنا چاہتا ہے تو ایک ہی طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ وہ صرف بیٹھ سکتا تھا یا کھڑا ہو سکتا تھا۔

میری نگاہیں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے میری طرف ایک قدم اٹھایا اور رک گیا جیسے کہ اُسے قریب آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ پھر وہ سلاخوں میں سے آسمان کی طرف تکنے لگا۔

"تم غلطی پر ہو، میرے بیٹے!" اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم سے اور تقاضا کیا جا سکتا ہے۔ میں شاید تم سے یہ تقاضا کروں گا۔"

"کاہے کا ——؟" میں نے کہا۔

"میں تم سے تقاضا کروں گا کہ تم دیکھنے کی کوشش کرو۔"

میں نے کہا:

"کیا دیکھنے کی کوشش کروں؟"

پادری نے بغلیں جھانکنا شروع کر دیں اور جب اُس نے بات کی تو مجھے محسوس

ہوا کہ اُس کی آواز میں ایک دم بہت افسردگی پیدا ہو گئی ہے۔

"میں خوب جانتا ہوں کہ یہ پتھر کی دیواریں انسان کے درد و غم سے بھرپور ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر کھِل اُٹھتا ہوں۔ یقین جانیئے کہ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے بات کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ حقیر سے حقیر آدمی بھی کبھی نہ کبھی ظلمتوں میں ایک ربانی چہرہ کا اُجالا دیکھتا ہے۔ وہی چہرہ ہے جسے دیکھنے کی میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں۔"

اس پر مجھے کچھ طیش آ گیا۔ میں نے کہا کہ کم از کم مہینوں سے میں ان موٹی اور اُونچی فصیلوں کو دیکھ رہا ہوں۔ دنیا بھر میں نہ کوئی چیز ہے نہ کوئی شخص جسے میں ان سے بہتر پہچانتا ہوں۔ شاید بہت عرصہ ہو چکا ہے کہ میں نے کسی چہرے کی تلاش نہیں کی۔ مگر وہ چہرہ جس کی مجھے تلاش ہے۔ اس کا رنگ سُورج کی مانند سنہری اور اس کا شعلہ ایک حسرت، ایک تمنائے شوق لئے ہوئے ہے۔ یہ ماری کا چہرہ تھا۔ میں نے اُسے بے سُود ڈھونڈا۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور بہر حال میں نے کبھی پتھر کا پسینہ بہتے ہوئے نہیں دیکھا۔

پادری نے مجھے اداسی سے دیکھا۔ اب میں پوری طرح دیوار کے ساتھ کمر ٹیک کر بیٹھا ہوا تھا اور مجھے دن کی خنکی ماتھے پر محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے کچھ کہا جو میں سُن نہ پایا اور پھر اچانک اُس نے پوچھا کہ کیا وہ مجھے بوسہ دے سکتا ہے؟

"نہیں ——!" میں نے جواب دیا۔

وہ مڑا اور دیوار کی طرف چلنا شروع کر دیا جس پر آہستہ سے وہ ہاتھ پھیرتا جاتا تھا۔

"آپ کو واقعی محبت ہے اس زمین سے۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر مڑنے میں اُس نے کافی وقت لیا۔ اس کی موجودگی سے مجھے کوفت اور پریشانی سی ہو رہی تھی۔ میں کہنے ہی والا تھا کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے کہ اُس نے ایکا ایکی پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور میری طرف مڑتے ہوئے کہا:

"نہیں نہیں! مجھے آپ کا اعتبار نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی آپ میں دوسری زندگی کی خواہش ضرور ہے۔"

میں نے جواب دیا:

"طبعی طور پر ہے مگر میرے لئے یہ خواہش اتنی ہی اہم ہے جیسا کہ امیر ہونے کی آرزو یا تیز تیرنے کی خواہش یا ایک موزوں چہرے کے مالک ہونے کی تمنا۔ ان سب کی نوعیت ایک ہی ہے۔"

میں اسی انداز میں بات کر رہا تھا کہ اُس نے مجھے ٹوک دیا اور پوچھا کہ میرا دوسری زندگی کا تصور کیا ہے۔ پھر میں چلّایا:

"ایک ایسی زندگی جو مجھے اس زندگی کی یاد دلائے۔" اور فوراً ہی بعد میں نے کہا کہ اب کافی ہو چکا۔

وہ چاہتا تھا کہ پھر سے خدا کا تذکرہ چھیڑے مگر میں اس کی طرف بڑھا اور آخری بار اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے اور میں اسے خدا کے لئے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ پھر اُس نے مضمون بدلنے کی کوشش کی۔ یہ کہتے ہوئے کہ میں اُسے ہر پادری کی طرح "باپ" کہہ کر خطاب کیوں نہیں کرتا۔ اس سے میں اور چڑ گیا اور اُسے جواب دیا کہ اس لئے کہ وہ میرا باپ نہیں ہے۔ برعکس اس کے وہ دوسروں کا طرف دار ہے۔

"نہیں میرے بیٹے!" میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اُس نے کہا "میں تمہارے ساتھ ہوں اگرچہ تمہیں اس کا احساس نہیں۔ کیونکہ تمہارا دل پتھر ہو گیا ہے۔"

اُس نے مزید کہا:

"میں تمہارے لئے دُعا کروں گا۔"

پھر مجھے معلوم نہیں کیوں میرے کچھ ناسور تھے جو پھٹ پڑے۔ میں نے بلند آواز میں چلّانا شروع کر دیا اور اس کی بے عزّتی کی اور میں نے اُس سے کہا کہ وہ میرے لئے فضول دُعا نہ کرے۔ میں نے اُسے گریبان سے پکڑ لیا، جو میرے دل میں آیا میں نے اناپ شناپ اس پر تھوپ دیا۔ خوشی اور غصّے کی ملی جلی کیفیت میں میں اُسے تاڑ رہا تھا۔

اس کا انداز بڑی خود اعتمادی کا تھا۔ مگر میری نظر میں اس کے اعتماد کی وقعت ایک عورت کے بال برابر نہ تھی۔ اُسے تو اپنی زندگی پر بھی یقین نہ تھا کیونکہ وہ ایک مُردے کی طرح زندہ تھا اور میں ___ مجھے معلوم تھا کہ میں خالی ہاتھ ہوں۔ مگر دراصل مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا۔ مجھے سب پر اعتماد تھا۔ اس سے کہیں زیادہ۔ اپنی زندگی پر اور اس موت پر جو آنے والی تھی۔ ہاں! میرے پاس اس اعتماد کے سوا کچھ اور نہ تھا کم از کم میں اس حقیقت پر اتنا ہی قابض تھا جتنا وہ مجھ پر قابض تھی۔ میں حق پر تھا۔ میں ہمیشہ حق پہ تھا۔ میں نے اس طرح اپنی زندگی گزار دی ہے اور اگر میں چاہتا میں اسے ایک اور طریقے سے بھی گزار سکتا تھا۔ میں نے یہ کیا تھا اور وہ نہ کیا تھا۔ میں نے ایسے کام نہ کئے تھے مگر ویسے کام کئے تھے۔ اور پھر! یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں نے زندگی بھر اس لمحہ کے انتظار میں گزار دی ہے۔ پو پھٹنے کے انتظار میں تاکہ وہ میری صداقت کی گواہی

دے سکتے۔ کسی چیز کی کوئی اہمیت نہ تھی اور مجھے خوب معلوم تھا کیوں؟ یہ میں بھی جانتا تھا کہ کیوں۔ اس ساری بے کار زندگی کے دوران ایک گمنام نامعلوم نفس میرے مستقبل کی گہرائیوں کو پاٹتا ہوا، ان سرد سال کو پھلانگتا ہوا جو ابھی معرضِ وجود ہی میں نہ آئے تھے میری طرف بڑھتا رہا اور مجھ سے کہتا رہا کہ اس زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بھلا میرے لئے کیا اہمیت ہو سکتی ہے، دوسروں کی موت کی، ایک ماں کی محبت کی، خدا کے وجود کی، اس طرزِ زندگی کی جو آدمی اپنے لئے انتخاب کرتا ہے۔ اس تقدیر کی جسے وہ اپنے لئے چن لیتا ہے۔ مگر وہی تقدیر مجبور ہے کہ نہ صرف مجھے بلکہ مجھ جیسے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو چنے۔ مجھے تو صرف ایک زندگی ملی اور میرے ساتھ لاکھوں کو جنہیں دراصل اقتدار حاصل ہے مگر اپنے آپ کو میرا بھائی کہتے ہیں۔

سمجھا وہ اسے؟ پھر اسے وہ سمجھا؟ ہر زندہ انسان کو اقتدار حاصل ہے۔ سب کو رعایت اور حق حاصل ہے۔ انسان کی ایک ہی قسم ہے۔ دوسروں کو بھی کسی دن قتل کا حکم ملے گا۔ ان کو بھی کوئی موت کا حکم سنائے گا۔ کسی پر الزام لگانے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ اپنی ماں کے جنازے پر نہ رویا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر مرنا تو سبھی کو ہے۔ سلمانو کا کتا زیادہ قیمتی ہے یا اس کی بیوی؟ وہ چھوٹی سی مشینی عورت، جو ساکت بیٹھی رہی وہ بھی تو ایسی ہی مجرم ہے جیسے پیرس کی وہ عورت جس نے میسن سے شادی کر رکھی تھی یا ماری جس کی خواہش رہی کہ میں اُس سے شادی کروں۔ اس کی کیا اہمیت ہے کہ ریمون میرا یار غار ہے یا سیلسط؟ کس کی قدر کس سے زیادہ ہے؟ اس کی کیا اہمیت ہے کہ ماری اسی لمحہ کسی نئے مرسو سے عشق کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے جسے خود موت کا حکم ملا ہو کیا وہ میری اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکتا تھا کہ مستقبل کے

اندھیروں سے میری کیا مراد ہے۔ چلاتے چلاتے میرا دم گھٹنے لگا۔ سپاہی بھاگتے ہوئے
اندر آئے اور پادری کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک سپاہی نے
مجھے مارنے کی دھمکی دی۔ مگر پادری نے انہیں سمجھا بجھا کر الگ کر دیا۔ وہ مجھے دم
بھر خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرپور تھیں۔ اس نے منہ موڑا
اور میری کوٹھڑی سے چلا گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھے کچھ سکون آیا۔ میرا تکان سے برا حال ہو رہا تھا
میں تختے پر چت لیٹ گیا — میرا خیال ہے کہ میں بہت دیر تک سویا کیونکہ جب میری
آنکھ کھلی تو ستارے میرے منہ پر چمک رہے تھے۔ دیہات کی صدائیں ہلکی ہلکی مجھے سنائی
دے رہی تھیں۔ رات کی ٹھنڈی ہوا جو زمین اور نمک کی خوشبو سے معطر تھی، میرے گالوں
کو لگ رہی تھی۔ موسم گرما کا پرامن سکون سمندر کی لہروں کی طرح مجھے تھپک تھپک کر دلاسا
دے رہا تھا۔ پو پھٹنے سے ذرا پہلے میں نے جہاز کا سائرن سنا۔ اس نے ایک ایسی دنیا
میں رخصت سفر باندھنے کا اعلان کیا جس سے اب میں بالکل بے نیاز تھا۔ مہینوں بعد پہلی مرتبہ
مجھے امی کی یاد آئی۔ اب میں سمجھا کہ وہ زندگی کے اواخر میں ایک "منگیتر" کیوں لے بیٹھی تھیں
انہوں نے زندگی کا کھیل از سر نو کیوں کھیلنا چاہا تھا۔ وہاں بھی بوڑھوں کی رہائش گاہ میں
زندگی کے چراغ گل ہو رہے تھے اور شام ایک افسردہ التوائے جنگ۔ ایک عارضی صلح
کا اعلان کر رہی تھی۔ موت کے اس قدر قریب امی کی خواہش ہو گی کہ وہ آزاد محسوس کرے
اور نئے سرے سے زندگی کی تیاری کر سکے۔ دنیا میں کسی کو ان پر آنسو بہانے کا حق نہیں
پہنچتا۔ اور میں بھی نئے سرے سے ایک تازہ زندگی کی تیاری کر رہا ہوں۔ یوں معلوم
ہوتا ہے کہ اس غضب کے غصے نے مجھے سب آلائشوں سے پاک کر دیا ہے۔ امید

اور امنگ سے خالی ان تاروں بھری رات میں مجھ پر پہلی مرتبہ دنیا کی نازک نرم اور ملائم
بے نیازی کا راز کھلا۔ یہ عین میرے اپنے تجربے کے مطابق تھا۔ بنی نوع آدم میں ایک
سلسلۂ اخوت ہے۔ اب مجھے نہایت خوشی کا احساس ہوا۔ اب میں مطمئن تھا۔ یوں منزل
مقصود پا کر میری تنہائی کا احساس کم ہو گیا۔ صرف ایک خواہش باقی رہ گئی۔ ایک ارمان کہ
میرے قتل کے دن بہت سے تماشائی جمع ہوں اور وہ میرا استقبال نفرت کے بھرپور
نعروں سے کریں۔

1435

باقیاتِ اقبالؒ

سیّد عبدالواحدؒ ○ محمّد عبداللہ قریشی

باقیاتِ اقبال میں حضرت علامہ اقبالؒ کا وہ کلام شائع کیا گیا ہے جو ان کی اپنی مطبوعہ تصانیف میں کسی وجہ سے جگہ پانے سے رہ گیا۔ ہر نظم یا غزل کے متعلق جو اس مجموعہ میں ہے حتی الوسع تحقیقات کر لی گئی ہے کہ یہ علامہ مرحوم ہی کی ہے۔ جو چیز جہاں سے لی گئی ہے اس کا حوالہ دیا گیا ہے اور کلام کو تاریخ وار درج کیا گیا ہے تاکہ خیالات کا ارتقاً سمجھنے میں مدد ملے۔ بعض نظمیں اقبالؒ کی زندگی پر بالکل نئی روشنی ڈالتی ہیں۔

قیمت
-/۴۵
روپے